اپنے پرائے
اوم پرکاش بجاج
110025
نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دلی

اپنے پرائے

(افسانے)

اوم پرکاش بجاج

نئی آواز۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

تقسیم کار

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی، 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

بار اول فروری ۱۹۸۰ء قیمت ۹/-

(جمال پریس، دہلی)

انتساب

اُردو ادب کی آبرو
جناب مالک رام
کے نام

فہرست

ریوتی سرن شرما

سیدھے آدمی کی سیدھی کہانی

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ادم پرکاش بجاج کی غزلوں کا مجموعہ میرے سامنے ہوتا، لیکن ہے اُن کی کہانیوں کا مجموعہ۔

اور حیرانی یہ ہے کہ یہ بھی بدرجہ اتم ان کی تخلیقی خوبیوں کا آئینہ دار۔ اور ان کی ہر کہانی بجاج کی شخصیت اور ان کے فلسفۂ حیات سے، الہ آباد کے پاس گنگا اور جمنا کے پانیوں کی طرح، نہ صرف مل کر، لپٹ کر اور گل بہیاں ڈال کر چلی ہے۔ بلکہ ایک ہو گئی ہے۔ اس لیے جو بجاج کو جانتے ہیں۔ انھیں ان میں بجاج کی سادگی، ان کا ایثار، ان کی گول گول آنکھوں میں کبھی کبھی جاگ اٹھنے والی بے ضرر شرارت اور تحیر نظر آتے ہیں۔

"اپنے پرائے" سے لیکر آس کی کلیاں تک پڑھنے کے بعد پہلی بات جو دماغ پر ابھرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ جن کی کہانیاں ہیں انھیں ہم جانتے ہیں، وہ ہمارے محلے میں، ہماری گلی میں، ہمارے گھر میں بلکہ کبھی کبھی ہمارے 'اندر' رہتے ہیں۔

پھر ان سے ہماری ملاقات بجاج نے پرانے فوٹو گرافروں کی طرح عاقلانہ، فاضلانہ، فلسفیانہ، کیمرہ کا کالا کپڑا اپنے چہرے پر ڈال کر اور انھیں 'فنی پوز' میں بٹھا کر نہیں کرائی۔ کردار نیچرل طرح سے نظر آتے ہیں اور انھیں پا جا، تا ڈ تائی

یاد دست کہنے کو جی چاہتا ہے

بجاج نے اونچی بات کہی ہے، لیکن اونچے، بناوٹی یا خارجی انداز میں نہیں کہی۔ ہر کہانی جہاں افسانہ ہے، وہاں سماجی یا انسانی تاثر بھی چھوڑتی ہے۔

اس طرح "اپنے پرائے" کی کہانیوں کا ایک عنوان یہ بھی ہو سکتا ہے "سیدھے سادے آدمی کی سیدھی سادی کہانی" یہ نہ صرف موزوں عنوان ہوگا بلکہ رام لگتی تفسیر۔

اپنے پرائے ایک بے اولاد بیوہ کی کہانی ہے جس کی زندگی ختم ہو چکی ہے بس ایک موت باقی ہے جسے وہ آخری وقت دو بوند آنسو، گنگا جل اور ہندو انتم سنسکاروں کے ساتھ ختم کرنا چاہتی ہے تاکہ کم از کم اس کا دوسرا جنم سدھر جائے۔ جیوان کا درد ایک ہندو بیوہ کا نہیں، ایک ایسی ہندوستانی عورت کا درد ہے جس کی مکتی ابھی تک مرد کے ہاتھ ہے، چاہے وہ اس کا شوہر ہو یا اس کا بیٹا۔ جیواں میں ہر آدمی اپنی "ماں" تلاش کر سکتا ہے۔ اور اس کے بے حس اپنوں میں اپنے کو۔ "روشنی" میں ماں نہیں ہے، مگر عورت ہے...... ایک بیٹی اور بہن کے روپ میں جو اپنی زندگی کی خوشی کو خاندان کی خوشی کے لیے ختم کر دیتی ہے۔ سروج اپنے بوڑھے ماں باپ اور بہن کے لیے نوکری ہی نہیں کرتی بلکہ شادی سے انکار کر دیتی ہے تاکہ اس کی بہن پڑھ لکھ جائے اور اس کی شادی ہو جائے۔ یہاں بجاج عورت کے اس ابھرتے روپ کو پیش کرتے ہیں جو معاشرے میں نہ صرف اپنی قسمت کی خود مالک بن رہی ہے بلکہ ذاتی جذبات کی قیمت ادا کر کے دوسروں کی قسمت بنائے جا رہی ہے۔ عورت کی یہ نئی شخصیت لال جھنڈے اور نعروں کے ذریعے نہیں، بلکہ مدھم سروں میں ابھار کر بجاج نے بدلتی سماجی شخصیت کو فطری اور غیر ڈرامائی روپ میں پیش کیا ہے۔

میں نے شروع میں بجاج کی گول گول چمکتی آنکھوں کا ذکر کیا جس میں کبھی کبھی بے ضرر شرارت دکھائی پڑتی ہے۔ یہ شرارت مجموعے کی کہانیوں میں بھی رقصاں و درخشاں ہے۔ بجاج کو آدمی کی چالاکی اس کے سفلے پن اور مطلب پرستی سے نفرت ہے وہ آدمی کو شریف اور بامروّت دیکھنا چاہتا ہے اس لیے کبھی کبھی وہ آدمی کی چالاکی کے "شاہ" کو دوسرے آدمی کے "پیادے" سے مات دلاکر نہ صرف مزے دار سلیقگی پیدا کرتے ہیں بلکہ بالواسطہ طور پر زندگی کا اخلاقی توازن قائم کرتے ہیں "شطرنج کے مہرے" میں حریص باپ اپنے دوست کی دولت اور جہیز کی نعمت سے مستفید ہونے کے چکر میں اپنا بیٹا ہی گنوا دیتا ہے، جو بمعہ جہیز اپنے سُسر کے ساتھ کویت چلا جاتا ہے۔

پرائی بیٹی، اپنی بیٹی میں کنتی کی ماں دوسروں پر کیچڑ اچھالتی ہے۔ زندگی کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے لیکن شطرنج کے کھلاڑی، کے بیٹے کی طرح یہاں اس کی اپنی بیٹی اُس کی غیر صحت مندحرکتوں سے بغاوت کرکے اسے سبق سکھاتی ہے کہ کفر کعبہ سے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

اسی طرح آرزو، آرزو، کی شوبھا اور نجات کی ٹھانہ دادی کو بجاج سبق سکھاتے ہیں۔ شوبھا اپنے بوڑھے سسر کو گھر سے نکالنا چاہتی ہے، لیکن اس کے بینک کی پرانی پاس بک دیکھ کر اس کے روپے کی خاطر ان کو گھر میں رکھ لیتی ہے اور بعد میں اسے پتا لگتا ہے کہ پاس بک ایسے بینک کی تھی جو فیل ہو چکا تھا ٹھانہ دادی سارے محلے کا ناطقہ بند رکھتی ہے۔ اپنے کو بہت عقلمند اور افضل سمجھتی ہے لیکن بجاج ایک دن اسے بھینس خریدنے کے سودے میں پوری طرح ٹھگوا کر سبق دیتے ہیں کہ آسمان کا تھوکا حلق میں آتا ہے اور چالاک بھی ایک دن منہ کی کھاتا ہے۔

کچھ اسی طرح کا لیکن زیادہ گہرا، زیادہ سماجی شعور اور اخلاقی توازن، وہ دادا جان کی آنکھیں میں قائم کرتے ہیں۔ بدری ناتھ دنیا کو جل دیتا ہے۔ ہر غلط طریقہ برت کر دولت جمع کرتا ہے لیکن قدرت بھی اس کے ساتھ برابر کا مذاق کرتی ہے اور پُر شرارت انتقام لیتی ہے۔ عین اس وقت جب وہ عیش کے تمام تر سامان اکٹھے کر پاتا ہے اس کی صحت دغا دے جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے صرف اُبلی سبزیاں کھانے کی اور مکمل اعتدال سے رہنے کی صلاح دیتے ہیں اور جس نے دنیا کو ٹھگا تھا، خود اپنے جسم کے ہاتھوں ٹھگا جاتا ہے۔ زندگی اپنا اخلاقی توازن کسی اور طرح قائم کر دیتی ہے۔

دراصل بجاج نیکی، انسانی شرافت، اور اعتدال کے قائل ہیں وہ نہ خود بُرے ہیں، نہ کسی کو برا ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ زندگی خوبصورت رہے، نیک رہے حالات، واقعات، اتفاق زندگی اور شرافت کے حق میں سازگار رہیں۔ یہی بجاج کی دُعا اور تمنا ہے۔ ’کھڑکی‘ میں رما حالات کے آگے جھک کر اپنی عزت بیچنا چاہتی ہے لیکن عین وقت پر اس کے شوہر کو نوکری مل جاتی ہے اور وہ گرنے سے بچ جاتی ہے۔

کتنی بلندی، ’کتنی پستی‘ میں مرلی دھر کو کیا ایمان اور آدرش سے گرنے کا پھل نہیں ملتا ہے؟ ’نفرت‘ میں نرمل مرد سے نفرت کے جذبہ کا دائمی شکار ہونے سے بچ جاتی ہے اور اسے وہ مرد مل جاتا ہے جو اس کی نسائیت کو بچا لیتا ہے۔ معجزہ کے ہیرو ہین تک کو بجاج بچا لیتے ہیں اور آخری وقت میں نوکری دلا دیتے ہیں۔ حالاں کہ یہاں وہ اپنے مزاج کی میٹھی شرارت کا ثبوت، زیادہ دیتے ہیں۔ زندگی کے اخلاقی توازن کے متین، سنجیدہ ایثار کا کم۔ ’ایک لمحہ پہلے‘ اور ’آس کی کلیاں‘ تو گویا بجاج کی خوش گوار ازدواجی زندگی کی مٹی سے اُگی ہوئی کہانیاں ہیں۔ بجاج میاں بیوی

کے خوبصورت رشتہ کو اس کی تمام تر خوبصورتی اور پاکیزگی کے ساتھ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ دونوں افسانوں میں عورت مرد یا شوہر بیوی توازن پالیتے ہیں اور ایک مرتبہ پھر انسانی رشتے کے سب سے پاکیزہ پائدار اور راحت فزا گٹھ بندھن میں اپنے دل کی گرہ کھول لیتے ہیں۔

یہ ہے بجاج کے افسانوں کا وہ نظام جسے میں ایک سادہ آدمی کی سادہ کہانی کا نام دینے کے سوا اور کوئی نام دینا نہیں چاہوں گا، کوئی تصنّع، کوئی بغاوت، کوئی عقلی یا ادبی ڈھونگ بجاج نے نہیں رچا۔ بس اپنی روح سے بہنے والی انسان اور انسانی شرافت اور انسانی رشتہ میں ایمان کی کہانی کو ایسے ڈھنگ سے کہہ دیا ہے کہ وہ دل کو چھوتی ہے۔ ہاں انجام سب کے چونکا دینے والے بنائے ہیں آپ پتا نہیں لگا سکتے کہ کہانی ختم کہاں ہوگی۔ یہاں سیدھا سادا بجاج نہیں۔ چالاک چوکنا اور چکمہ دینے والا فن کار ہے یہ بھی اس کی ایک اور فنی شرارت ہے جس کے بنا آدمی ادم پرکاش بجاج ہو سکتا ہے، افسانہ نگار بجاج نہیں۔

بجاج رواں دواں نثر لکھتے ہیں۔ جس میں کئی جگہ شاعری بے جا ہے اور کھٹکتی ہے۔ لیکن یہاں بھی بجاج نے ایسے نثری ٹکڑوں سے ادبی اور تخلیقی توازن بہم کر لیا ہے:۔

> جیوان نے جب یہ بات کہی تو اس کی نگاہیں نیچے کو جھکیں۔ اپنی بات پوری کر کے جوں ہی اس نے شام لال کے چہرہ پر اپنی بات کا ردِّ عمل دیکھنے کے لیے نظریں اٹھائیں، رسوئی میں ایک دھماکہ سا ہوا۔ جیسے کسی نے پانی کا بھرا برتن اوپر اٹھا کر ہاتھ سے چھوڑ دیا ہو۔ جیوان پکاری، ہو کیا ہوا۔ اور شام اٹھ کر رسوئی کی طرف بھاگا۔ اس کے پیچھے پیچھے جیوان بھی اٹھ کر جانے والی تھی کہ اس

نے سُنا رسوئی میں سناٹا تھا۔ نہ شام لال کے یہ پوچھنے کی آواز آئی کہ کیا ہوا اور نہ رام دئی کا جواب سنائی دیا، اور عورت نے عورت کو سمجھ لیا، جیواں کو اس سلسلے میں کوئی شبہ نہ رہا کہ رسوئی میں جو برتن گرا تھا وہ رام دئی نے عمداً شام لال کو اندر بلانے کے لیے گرایا تھا۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔

(اپنے، پرائے)

لیکن پچھلے کچھ مہینوں سے سدھا کی کھڑکی کی شکل، اس کے اندر کا منظر بالکل بدل گئے تھے۔ کھڑکی پر اب رنگین ریشمی پردے سرسراتے تھے۔ اس میں سے ایک ایسا کمرہ نظر آتا تھا، جس میں فلورسینٹ ٹیوب کی روشنی تھی۔ ڈسٹمپر کا ہلکا آسمانی رنگ تھا۔ دیواروں پر خوبصورت تصاویر تھیں۔ فرش پر صوفہ تھا۔ ہر وقت لوگوں کے قہقہوں، اور ریڈیو سیلون کے فلمی نغموں کی گونج تھی۔

رما اپنے حالات سے گھبرا کر اپنی کھڑکی سے باہر دیکھتی تو اسے سدھا کی کھڑکی نظر آتی اور جب اس کھڑکی سے اسے اندر کا، اپنے گھر جیسا بدحالی کا نقشہ دکھائی دیتا تو جیسے اسے سہارا مل جاتا۔ بے اطمینانی، کم مائیگی اور مفلسی کا ڈستا ہوا احساس کچھ کم ہو جاتا اور وہ صبر کر لیتی کہ غم اور غریبی نے اسے ہی نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنے عتاب کا شکار بنا رکھا ہے۔ اگر وہ مفلوک الحال محروم ہیں تو اس میں ان کا اپنا قصور نہیں ہے، زمانے کا قصور ہے۔ غریب محنت کش کی۔ ایمان دار کی اس دنیا میں کوئی خبر ہی

نہیں لیتا۔

(کھڑکی)

لیکن دنیا تو تجھے بھی نہ بخشے گی۔ وہ کہیں گے تو بھی ان لڑکیوں کی طرح آوارہ ہو گئی ہے۔

وہ کچھ بھی کہیں مجھے پرواہ نہیں لیکن ضرور معلوم ہو جائے گا وہ لڑکیاں جو کام کرتی ہیں اتنی بُری نہیں جتنی تم سمجھتی ہو، اپنی بیٹی کو دیکھ کر تھیں دنیا کی بیٹیوں کا اصل روپ نظر آجائے گا۔

(پرائی بیٹی، اپنی بیٹی)

دوسرے پنڈال میں لگی ہوئی میزیں جوں کی توں پڑی تھیں، چائے کے لیے رکھا ہوا پانی مرلی دھر کے دل و دماغ میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے غم و غصہ کی طرح کھول رہا تھا۔ ریسٹوران کے بیرے ان قلیوں کی طرح کھڑے دکھائی دے رہے، جو کسی مسافر کا سامان اتارنے کے لیے جھپٹے ہیں۔ لیکن اس کو لٹا پٹا دیکھ کر اپنی خفت مٹانے کے لیے دوسری طرف منہ کر کے ایسے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے وہ یوں ہی آئے تھے۔ یوں ہی کھڑے ہیں

(کتنی بلندی، کتنی پستی)

مہیب خاموشی میں جب کبھی وہ آنکھیں بند کر کے دیکھتا تو اب اس کا سیاہ ماضی ابھرنے لگتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ زندگی اسے اس کے سیاہ اعمال کی سزا دے رہی ہے اس خیال کے آتے ہی اس کے ذہن میں دادا جان کی آنکھیں ابھرنے لگتیں جنھوں نے اسے سیدھے رستے پر چلنے کی ہدایت کی تھی مگر اب وہ

سنبھلنے کی حد سے گزر چکا تھا مجبور اور بے بس پنچھی کی طرح پنجرے سے سر پٹخنے کے سوا اس کے پاس اب چارہ بھی کیا تھا ؟ اور زندگی کے ہر محاذ پر فتح پانے والا بے دھڑک سپاہی قدرت کے انصاف کے آگے ہار گیا تھا اور دادا جان کی بڑی بڑی آنکھیں اپنے پوتے کی زندگی کے اس المیہ کو غم و غصے کے ملے جلے جذبات سے دیکھے جا رہی تھیں۔

(دادا جان کی آنکھیں)

"تم آگئیں پرشوتم نے یکایک مسرت سے لبریز لہجہ میں کہا "ہاں' میں بن بلائے آگئی۔ اب خوش ہو تم ؟" سدرشن کے چہرے پر شکست کے سوز کی پرچھائیں اور گہری ہو گئیں اس کی آواز تقریباً بھرا گئی۔ اس کی آنکھوں میں ہار کی علامت کے آنسو جھلملانے لگے۔

اور پرشوتم کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی انا کے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو۔ اس کی بدگمانی کے مکروہ چہرے کو آئینہ دکھا دیا ہو۔ اس کی محبت کو اپنی بلند بے پایاں محبت کے مقابلہ میں رکھ کر حقیر اور بے معنی ثابت کر دیا ہو وہ ندامت کے پانیوں میں بھیگ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سدرشن کو اپنی باہوں میں لے لیا اور اس کے بالوں میں منہ چھپا کر بولا "سدرشن تم بنا بلائے نہیں آئی ہو۔ تم کو میں نے بلایا ہے۔ میں نے.... اس خط کے ذریعے جواب بھی میری جیب میں محفوظ ہے۔ جسے میں ابھی ڈاک میں ڈالنے جا رہا تھا۔ تمہارا آنا تمہاری ہار نہیں

تو میرا خط لکھنا بھی میری ہار سے کم نہیں ہے۔ کیوں کہ میں نے محسوس کر لیا۔۔۔۔ میں تمھارے بنا رہ نہیں سکتا، نہیں رہ سکتا

(ایک لمحہ پہلے)

اٹا بروقت۔ مجھے احساس ہو گیا کہ میرے قلم کی کمائی کا صحیح استعمال میرے بچوں کی تعلیم و تربیت ہے چائے اور سگریٹ نوشی نہیں۔ غلط قسم کے دوستوں پر پیسہ ضائع کرنا نہیں بے کار وقت برباد کرنا نہیں۔

اور ندامت کے پانی کی گہرائیوں میں ڈوبتی پشپا جیسے ابھر آئی اور سیلاب کی زد میں بہتا ہوا نوراج جیسے لنگر ڈالی ہوئی ناؤ کی طرح ٹھہراؤ پا گیا اور جب دونوں نے اپنا توازن پا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو انھیں محسوس ہوا کہ سیلاب اتر گیا ہے۔ محبت کا سورج نکل آیا اور مستقبل کا آسمان امید اور مسرت کے نور سے جگمگا اٹھا ہے

(آس کی کلیاں)

لوگ تحفے محبت کی خاطر نہیں دیتے۔ لوگ اپنے مطلب، اپنی غرض سے مجبور ہو کر تحفے دیتے ہیں۔ پشپا اور تھانے دار نی کے گھر جو تحفے تحائف اس نے دیکھے تھے وہ دراصل ان بچوں کے لیے نہیں تھے وہ ان غرضوں، اور کاموں کے لیے تھے جو لوگ پشپا کے پتی اور تھانے دار سے نکال سکتے تھے وہ ایک طرح کی رشوت تھے جو ہر بڑے اور با اثر آدمی کو جنم دن اور شادی کے نام پر کاغذ میں لپیٹ کر دی جاتی ہے۔ اس کا پتی تو کوئی بڑا آدمی نہ تھا

وہ کسی بڑے اور با اثر آدمی کی بیوی نہ تھی۔ ان سے تو کسی کے کام نہ نکل سکتے تھے، ان کے پاس تو محض خلوص تھا، محبت تھی مہمان نوازی چاہ تھی، امنگ تھی سلیقہ تھا۔ پھر اس نے یہ غلطی کیوں کی کہ دنیا سے امید رکھی، اپنے خلوص اور اپنی محبت کا حسین سا جواب چاہا۔

(جنم دن)

اپنے پرائے، کے افسانے پرائے نہیں اپنے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔ آئینہ وہی ہے جس میں اپنی شبیہ اپنی نظر آئے۔ پرائے پرائے رہتے ہوئے بھی غیر، یا غیر فطری نظر نہ آئیں۔

یہاں بجاج بجا طور پر تسلّی محسوس کر سکتے ہیں اور فخر بھی۔

۱۱ر نومبر ۱۹۷۷ء

ریوتی سرن شرما
سی ۱۸۰۔ آنند نکیتن۔ نئی دہلی

جیوان بڑے چین کے دن گزار رہی تھی۔ گو وہ جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھی اور بیوہ ہونے کے فوراً بعد ہی اُسے اپنے تین بچوں کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا اور وہ اس لمبی چوڑی دنیا میں بالکل تنہا اور اکیلی رہ گئی تھی لیکن اب وہ ان سب باتوں کو تقریباً بھول چکی تھی۔ وقت کے مرہم نے اس کے سینے کے سارے داغ بھر دیے تھے پہلے اسے زندگی کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی اکیلے پن اور سونے پن کا احساس برداشت نہ ہوتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اکیلی رہنے کی عادی ہو گئی۔ اس نے اس نراس خوشی غمی، تمنا وحسرت، سب طرح کے جذباتی جوار بھاٹوں سے بے نیاز ہو کر جینا اور زندگی کے دن کاٹنا سیکھ لیا تھا، اور جب انسان یہ سیکھ جاتا ہے تو زندگی اس کے لیے وبال دوش نہیں، بلکہ اُس دھارے کی طرح بن جاتی ہے جو گرمی سردی بہار پت جھڑ ہر موسم میں ایک سی پرسکون روانی کے ساتھ بہتا رہتا ہے جیوان کی زندگی سچ مچ اس دھارے کی طرح بن گئی تھی، اس کے شوہر نے اتنا پیسا اور گہنا چھوڑا تھا کہ وہ اب تک اس کو نکال نکال کر کھائے جا رہی تھی گو وہ ساٹھ سال کی ہونے کو آئی تھی۔ لیکن اُس پیسہ اور نقدی کی وجہ سے اس کی خود اعتمادی یا اُس کے اطمینان میں کمی نہ آنے پائی تھی اسے زندگی سے خوف نہ آتا تھا۔ مستقبل کی فکر نہ ستاتی تھی بلکہ کبھی کبھی تو بیوہ ہو جانے اور اولاد سے محروم ہو جانے کی وجہ سے اُسے زندگی بہت

ہی ہلکی، آسان، رنج دمحن اور فکر و پریشانی سے آزاد معلوم ہوتی۔ وہ اپنی پڑوسن
بھاگونتی سے، جو اسے اپنی ماں کی طرح مانتی تھی، کہا کرتی۔

"کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے بھاگونتی۔ آنکھ پھوٹی پیڑ گئی۔ آدمی نہ رہا۔ اولاد
نہ رہی۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ مجھے کسی طرح کی فکر تو نہیں ہے ورنہ دیکھتی ہوں
کسی کو آدمی کا دکھڑا ہے کسی کو بہو بیٹے کی شکایت ہے۔ کوئی پوتے اور دھوتے کے
لیے مرد ہی ہے۔ پر میں تو دنیا سے ورکت ہو کر بیٹھی ہوں جب بھگوان کا جی چاہے
بلا لے۔ نہ یہاں رہنے کی خوشی، نہ یہاں سے جانے کا غم"

ایسے موقع پر اکثر بھاگونتی اس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیتی "یہ کیسی بات کرتی
ہو، تمھیں یہاں سے جانے کا دکھ نہ ہو گا۔ پر کسی اور سے تو پوچھو۔ میں نے تو اپنی
ماں کی جگہ تمھیں سمجھا ہے۔ میں تمھیں کیسے جانے دوں گی۔ میرے سامنے تو تم ایسے بول
نکالا نہ کرو۔ ہاں"

اور بھاگونتی کے یہ محبت بھرے بول سن کر اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی
نمی دیکھ کر جیوان نہال ہو جاتی تھی "اری تو آنسو بھر لائی۔ میں تو ہنسی کر رہی تھی بھلا مجھ
جیسی جنم جلی کو موت کہاں رکھی ہے۔ مجھے معلوم ہے میں یہاں سے جانے والی نہیں ہوں،
مجھ سے تو موت بھی کتراتی ہے۔ میں تو اگر جاؤں گی بھی تو تجھ سے پوری سیوا کرا کے
جاؤں گی" اور یہ کہتے کہتے جیوان کے دل سے موت کا خیال پوری طرح نکل جاتا۔ اسے
سچ مچ محسوس ہوتا جیسے وہ کبھی نہیں مرے گی۔ بہت دن جیے گی اور وہ بھاگونتی کا ہاتھ
پکڑ کر کہتی "اچھا اٹھ یہ چابی لے۔ اندر کوٹھری میں گھی کا ہنڈا رکھا ہے۔ کٹوری میں گھی
نکال لا اور میرے سر میں لگا دے۔ بس کچھ بھاری سا لگ رہا ہے"

اور جیوان سر میں گھی لگواتی۔ صبح کو آدھ سیر دودھ اور دو پراٹھے کھاتی۔ دوپہر
کو جو چیز کھانے کو جی کرتا پکاتی اور کھانے کے بعد گھومنے، کیرتن یا کتھا سننے چلی جاتی

تیسرے پہر پھر آتی تو بھاگونتی اس کے لیے چائے تیار رکھتی اور انگیٹھی سلگا دیتی۔ چائے پی کر وہ پھر اپنی من پسند سبزی بناتی اور روٹی کھا کر آرام سے رات کریدتی ہوئی سو جاتی۔ رات کو وہ اپنی کوٹھری میں اکیلی ہوتی لیکن بھاگونتی کی وجہ سے اسے یہ احساس بھی نہ ہوتا کہ وہ اکیلی ہے۔ اوّل تو بھاگونتی برابر والی کوٹھری میں رہتی تھی، دوسرے وہ ہر وقت اس کا ہر کام کرنے کو تیار رہتی تھی۔ جس دن جیوان کا جی کھانے پکانے یا کپڑے دھونے کو نہ کرتا یا جس دن اس کا جی ٹانگیں یا بدن دبوانے کو کرتا وہ بے تکلف بھاگونتی سے جا کر کہہ دیتی اور بھاگونتی خوشی خوشی اس کا کھانا پکا کر گھر دے جاتی۔ اس کے میلے کپڑے دھونے کے لیے لے جاتی۔ گھنٹہ گھنٹہ بھر جسم اور ٹانگیں دبا جاتی۔ اس طرح بھاگونتی نے اس کے اندر یہ احساس کبھی نہ پیدا ہونے دیا کہ وہ اکیلی ہے لاوارث ہے اس کے دکھ درد کا کوئی بھاگی نہیں ہے۔ اس کی ہاری بیماری کا کوئی ساتھی نہیں زندگی کے اس چھور پر اس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں ہے۔

لیکن ایک دن جیوان کو محسوس ہوا جیسے وہ سچ مچ اکیلی ہے۔ لاوارث ہے، آخری وقت میں اس کا کوئی ساتھی یا سنگوانے والا نہیں ہے۔ آدمی کے لیے اور اولاد کے لیے جو دنیا مرتی ہے فضول نہیں ہوتی ہے۔ آدمی اور اولاد کی ضرورت ضرور ہوتی ہے۔ زندگی میں نہ سہی موت کے وقت اور موت کے بعد سہی بغیر اولاد کے بغیر آدمی کے بغیر اپنے رشتہ دار کے یہ جنم بھی اکارت ہے اور وہ دوسرا جنم بھی

اور یہ احساس بھی اس کے اندر بھاگونتی نے پیدا کیا تھا۔ جیوان تین چار دن سے بیمار تھی، ہلکا ہلکا بخار ہو جاتا تھا اور اس وجہ سے وہ اپنی کوٹھری سے بھی نہ نکلی تھی لیکن بھاگونتی برابر آ کر اس کا حال پوچھ جاتی اور اسے دوا اور کھانا دے جاتی تھی لیکن ایک دن بھاگونتی نہ دوپہر کو آئی اور نہ تیسرے پہر کو آئی اور جب رات کو آئی تو اس کا چہرہ سوکھا ہوا تھا۔ اور اس کی آنکھیں کسی مبہم سے

خوف سے پھٹی ہوئی سی تھیں۔ آتے ہی اس نے جیوان کو اس کی سہیلی ریشماں کی موت کی خبر سنائی۔ "بے چاری ریشماں چل بسی ماں جی۔ اس کے ساتھ بھی جیسی ہوئی بھگوان کسی کے ساتھ نہ کرے ماں جی" اور آگے الفاظ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں خوف سے اور زیادہ پھٹ گئیں "اس کی تو یہ بھی خبر نہیں کہ بے چاری کب مری۔ شام کو میں دیکھ کر آئی تھی۔ بخار کچھ زیادہ تھا میں نے اس سے کھانے کو پوچھا۔ بولی جی نہیں کرتا میں نے حال پوچھا کہنے لگی کیا حال ہے۔ کیا بتاؤں میں کوئی آٹھ ایک بجے آئی تھی۔ اس کے بعد کوئی اس کے پاس نہ گیا۔ رات بیتی صبح ہوئی دوپہر ہوئی کوئی بارہ ایک بجے ایک لڑکا اس کی کوٹھری میں گیا۔ اس کی گیند اندر چلی گئی تھی اندر جا کر کیا دیکھتا ہے کہ ریشماں مری پڑی ہے اس کا آدھا بدن کھاٹ پر ہے۔ آدھا دھڑ اوپر کا، نیچے زمین پر لٹکا ہوا ہے۔ اور ہاتھ دھرتی پر پڑے ہوئے پانی کے گلاس کی طرف بڑھا ہوا۔ جانے رات میں کس وقت پانی کے لیے ترستی مر گئی۔ ہائے ماں جی اس کے منھ میں تو آخری وقت میں کسی نے پانی بھی نہ ڈالا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں، اپنا ہو گا منھ میں پانی کی دو بوند تو ڈال دے گا اگر اس کا اپنا آدمی ہوتا، اس کے اپنے بچے ہوتے، اس کے پاس اس کا سگا سمبندھی ہوتا تو ......"

اگر اس کا اپنا آدمی ہوتا، اس کے اپنے بچے ہوتے، اس کے پاس اس کا سگا سمبندھی ہوتا تو ...." جیوان نے جیسے صرف اتنا ہی سنا اور آگے کچھ نہ سن سکی۔ یہ الفاظ بادل کی گرج بن کر اس کے ذہن میں اس کے شعور میں، اس کے وجود میں گونجنے لگے۔ ایک عجیب طرح کی آواز گونج کے ساتھ ساتھ اسے سنائی دینے لگی "تیرا بھی تو کوئی نہیں ہے۔ تیرا بھی تو آدمی نہیں۔ تیرے بھی تو بچے نہیں ہیں۔ تیرا بھی تو کوئی سگا سمبندھی تیرے پاس نہیں ہے۔ اگر کسی دن ریشماں کی طرح موت آئی اور رات کی کسی تاریک و تنہا گھڑی میں آئی تو تیرا پُرسان حال کون ہو گا؟ کون تجھے چارپائی سے نیچے اتارے گا

کون تیرے منھ میں گنگا جل اور تلسی کے پتے ڈالے گا، کون تجھے مرتے وقت گیتا کا پاٹھ سُنائے گا؟ کون جانے، کتنے دن تک تیرا مردہ بھی پڑا گھر میں سڑتا رہے اور کوئی تیری کوٹھری میں نہ آئے۔ تیری ارتھی کو اٹھانے والا نہ ملے۔ تیرا داہ سنسکار کرنے والا اور تیرے پھول ہردوار پہنچانے والا بھی میسر نہ ہو۔

اور بادل کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ساتھ یہ بھیانک الفاظ گونجنے گئے اور چارپائی پر پڑے پڑے جیوان کی آنکھیں پھٹتی چلی گئیں۔ گو بھاگونتی اسے دوا پلا کر اور اس کے لیے کھانا لانے کا وعدہ کرکے چلی گئی تھی۔ لیکن جیوان دوا، کھانا، بھاگونتی، سب کو مکمل طور پر بھول گئی تھی اب اس کے شعور پر ایک ہی سوال چھایا ہوا تھا۔ مرنے پر میرا کیا ہوگا؟ میری لاش کو کون سنگوائے گا۔ وہ زندگی کو قطعی بھول گئی اور موت کی بات سوچنے لگی۔ اُس موت کی جس کے تصور کو اس نے اپنے خیالوں میں جگہ نہ دی تھی۔ میں ساٹھ کی تو ہو ہی گئی ہوں کسی دن بھی مجھے موت آسکتی ہے۔ مجھے اب موت کی، اپنے انت سمے کی بھی تو سوچنی ہوگی، زندگی اکیلے کاٹ دی۔ موت کے وقت تو اپنوں کا کاندھا چاہیے۔ اگر یہاں اکیلے مری تو کون میری خبر لے گا۔ بھاگونتی؟ ٹھیک ہے وہ مجھے ماں کی طرح مانتی ہے لیکن وہ میری اپنی تو نہیں ہے۔ شاستروں میں تو اپنوں کے ہاتھوں داہ سنسکار اور پنڈدان لکھا ہے۔ اگر بھاگونتی نے میرا داہ سنسکار کر بھی دیا تو میری گتی تھوڑا ہی ہوگی۔ اور کیا معلوم۔ دوسرے کے، پرائے کے من کی کیا معلوم۔ اس کا آدمی نہ ملنے۔ میرے مرتے ہی میرا سامان ہڑپ کرلے۔ مرنے کے بعد میرا وہ نیا جوڑا اور شال بھی میری لاش پر نہ ڈالے جو میں نے اپنے مرنے کے وقت کے لیے بنا رکھا ہے۔ خرچے سے بچنے کے لیے پنچایت والوں سے مفت لکڑی لے کر میری چتا جلوائے پھول نہ اُٹھائے۔ میرا شرادھ بھی نہ کرے۔ میں اپنے کو پرایوں کے ہاتھوں میں نہ سونپوں گی۔ میں مروں گی تو اپنوں کی ڈیوڑھی میں۔ اپنوں کی گود میں۔"

اور اپنوں کا خیال کرتے ہی اسے اپنا بھتیجا شام لال یاد آ گیا" ہاں میں اپنے بھتیجے شام لال کے پاس جا کر رہنے لگوں گی۔ وہ اس شہر میں تو رہتا ہے۔ میرے بیٹے کی طرح ہی تو ہے۔ اپنے بیٹے اور بھائی کے بیٹے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اُس کی ماں کے مر جانے پر میں نے ہی تو اسے پالا پوسا تھا، وہ مجھے اناتھوں کی طرح مرنے نہ دے گا۔ باجے گاجے کے ساتھ میری ارتھی نکالے گا۔ ارتھی پر شال دوشالے ڈال کر پھول بتاشے پھینکے گا۔ اس کا بیٹا ارتھی پر چنور جھلے گا۔ اصلی گھی اور صاگری سے میری چتا جلوائے گا اور پھر میرے پھول لے کر ہر دوار جائے گا۔ میں کل ہی اس کے ہاں جاؤں گی۔ صاف کہہ دوں گی کہ مرنے کے لیے میں اس کے پاس آنا چاہتی ہوں۔ اُسے مجھے اپنے پاس رکھنا ہی ہوگا۔ اور وہ مجھے ضرور اپنے پاس رکھے گا۔ وہ ایسا نہیں ہے۔"

اور اس آس کو لے کر اگلے دن وہ سویرے سویرے شام لال کے گھر جا پہنچی تھی۔ بخار کی وجہ سے اسے کمزوری کافی تھی۔ اس نے بھاگونتی کے آنے اور چائے بنا کر دے جانے کا انتظار نہ کیا تھا، اس لیے وہ بھوکی بھی تھی۔ لیکن جب تک وہ شام لال کے گھر نہ پہنچ گئی، اسے کمزوری بھوک اور پیاس کسی نے ستایا۔ جب وہ شام لال کے گھر پہنچی تو شام لال بازار سبزی لینے گیا ہوا تھا۔ اس کی بیوی رام دتی نے جیوان کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر بوا کے پاؤں چھوئے اور انھیں سہارا دے کر چارپائی پر بٹھایا۔ جیوان نے محبت سے سرشار ہو کر دعاؤں کے خزانے کھول دیے اور فرطِ مسرت سے چارپائی پر سوتے ہوئے رام دتی کے بچے یعنی اپنے پوتے کو بار بار چوما۔ لیکن جیوان زیادہ دیر بیٹھی نہ رہ سکی۔ بخار کی کمزوری، پیدل چل کر آنے کی کمزوری اور بھوکا ہونے کی کمزوری۔ وہ ہار کر چارپائی پر لیٹ گئی اور رام دتی اس کے لیے چائے پراٹھے بنانے رسوئی میں چلی گئی۔

اسی اثنا میں شام لال آ گیا۔ بوا کو دیکھتے ہی اس نے بھی سبزی کا تھیلا رکھ کر

بوا کے پاؤں چھوئے اور اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ بوا کے چہرے کی زردی اور مرجھاہٹ دیکھ کر شام لال نے کہا "بوا تمھیں ہوا کیا ہے؟ تمہاری صحت تو مجھے بہت گری نظر آ رہی ہے"

"بیٹا۔ بڑھاپے میں جوان ہونا تھوڑا ہی ہے۔ اب تو گرنا ہی گرنا ہے" جیوان نے کھانستے ہوئے کہا

"لیکن اگر بیمار تھیں تو مجھے بلا لیتیں۔ اپنی بہو کو بلا بھیجتیں۔ ہم کس لیے ہیں۔ اب بھی آپ کے کام نہ آئے تو ہمارے جنم پر دھتکار ہے" شام لال نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹا — ایسی کوئی خاص بیمار تو نہ ہوئی تھی"

"لیکن پھر بھی بیمار تو تھیں آپ کو یا تو ہمیں بلا لینا تھا یا یہاں آجانا تھا۔ پر آپ تو مجھے اپنا بیٹا نہیں سمجھتیں نا؟"

جیوان کو لگا شام لال کا لہجہ جذبہ کی رقت سے رندھ گیا ہے۔ اس لیے اس سے اور زیادہ ضبط نہ ہو سکا۔ وہ کھل گئی "نہیں بیٹا یہ بات نہیں ہے۔ تجھے اپنا سمجھ کر ہی تو آج میں تجھے کہنے آئی تھی کہ اب میرا آخری سمے نزدیک ہے۔ مجھے اپنے پاس ہی جگہ دے دے۔ میں تمہیں لوگوں کے بیچ آنکھ بند کرنا چاہتی ہوں"

جیوان نے جب یہ بات کہی تھی تو اس کی نگاہیں نیچے کو تھیں۔ اپنی بات پوری کر کے جوں ہی اس نے شام لال کے چہرہ پر اپنی بات کا ردّ عمل دیکھنے کے لیے نظریں اٹھائیں، رسوئی میں ایک دھماکہ سا ہوا جیسے کسی نے پانی کا بھرا برتن اوپر اٹھا کر ہاتھ سے چھوڑ دیا ہو۔ جیوان پکاری 'بہو کیا ہوا'، اور شام لال اٹھ کر رسوئی کی طرف بھاگا۔ اس کے پیچھے پیچھے جیوان بھی اُٹھ کر جانے والی تھی کہ اس نے سنا۔ رسوئی میں سناٹا تھا۔ نہ شام لال کے یہ پوچھنے کی آواز آئی کہ کیا ہوا اور نہ سام وتی کا

جواب سنائی دیا۔ اور عورت نے عورت کو سمجھ لیا، جیوان کو اس سلسلہ میں کوئی شبہ نہ رہا کہ رسوئی میں جو برتن گرا تھا وہ رام وتی نے عمداً شام لال کو اندر بلانے کے لیے گرایا تھا۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔

کوئی پانچ منٹ بعد شام لال باہر آیا اب کے وہ بڑا بوکھلایا ہوا سا تھا اور اس نے جیوان سے آنکھ نہ ملائی۔ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بولا "اچھا بھاجی، میں ذرا جاتا ہوں میرے دفتر کو دیر ہو رہی ہے۔ شام کو میں آپ کے یہاں آؤں گا۔ دوا وغیرہ دے جاؤں گا"

"لیکن تیرے وہاں آنے کی کیا ضرورت ہے بیٹا" جیوان نے اپنے اندیشہ کو غلط ثابت کرنے کی غرض سے تقریباً ڈھٹائی کے ساتھ کہا "میں خود ہی دوپہر کو سامان لے کر یہاں آجاؤں گی، سامان ہی کتنا ہے"

"لیکن بھاجی" اور جیوان سمجھ گئی کہ اس کا اندیشہ صحیح تھا شام لال بڑا گڑبڑایا ہوا کہہ رہا تھا "ایسے تو آپ کا آنا سر ماتھے پر، مگر بات یہ ہے کہ...... بات یہ ہے کہ ہمارے پاس فی الحال ایک ہی کمرہ ہے۔ میں دو کمروں کا مکان تلاش کر رہا ہوں وہ مل جائے۔ جس دن وہ مل جائے میں خود آپ کو لے آؤں گا" شام لال نے یہ فقرہ ایسے ختم کیا تھا جیسے اس نے اپنے سر پر رکھا بوجھ اُتار پھینکا ہو۔ اور جیوان نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ یہ فقرہ شام لال کا اپنا نہیں۔ یہ کسی نے زبردستی اس کے سر پر رکھّا ہے۔ لیکن اسے ریشماں کی موت یاد تھی۔ اس لیے اس نے خودداری کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے ایک اور کوشش کی۔

"لیکن بیٹا میرے لیے کمرے کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں ناحق پیسے خراب کرتے ہو میں تو یہاں برآمدے کے ایک کونے میں پڑی رہا کروں گی"

"نہیں بھاجی" اب کے شام لال کا لہجہ دوٹوک تھا "ہم آپ کو اس بے قدری

سے نہیں رکھ سکتے۔ رکھیں گے تو عزت سے رکھیں گے۔ اس لیے میں مکان تلاش کر دوں پھر آپ بہ شوق آ جائیے گا۔ ہاں فی الحال آپ رادھا کے پاس رہ سکتی ہیں۔ اس کے پاس دو کمرے ہیں اور اس کی لڑکی بیمار ہے آپ چلی جائیں گی تو اسے بھی سہارا سا ہو جائے گا۔ چائے آتی ہے آپ پی کر تیار ہو جائیے۔ دفتر جاتے ہوئے رادھا کے گھر چھوڑتا جاؤں گا"

اشارہ واضح تھا اور جیوان میں خودداری باقی تھی اس لیے بنا چائے پیے بغیر شام لال کا انتظار کیے جیوان خود ہی اٹھی اور وہاں سے چلی آئی۔ اسے امید نہ تھی کہ شام لال یوں آنکھیں پھیر جائے گا۔ اس لیے اس کے دل کو بہت چوٹ پہنچی تھی لیکن اب اسے اپنی کوٹھری میں جاتے خوف آتا تھا، اب وہ اکیلی رہنے کی طاقت کھو چکی تھی، اس لیے وہ گھر جانے کے بجائے راستے سے کچھ کیلے اور سنگترے خرید کر اور تھیلے میں ڈال کر رادھا کے گھر کی طرف چل دی۔

رادھا جیوان کی بہن کی لڑکی تھی۔ وہ بھی اسی شہر میں رہتی تھی۔ جب جیوان اس کے مکان کے قریب پہنچی تو اس نے دیکھا رادھا دروازے پر ہی کھڑی تھی، جیوان کو دیکھتے ہی اس کے چہرہ پر خوشی کی ایک لہر دوڑنے لگی۔ لپک کر اس نے ماسی کے ہاتھوں سے تھیلا پکڑا اور اُسے سہارا دے کر اپنے مکان میں لے آئی ماسی کے چہرے سے زردی ٹپک رہی تھی۔ بڑھاپے اور تھکان کا خیال کرتے ہوئے۔ پہلے تو رادھا چپ رہی۔ آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔" ماسی جی بُرا نہ ماننا آپ اس قدر کمزور کیوں ہو گئی ہیں؟"

"بیٹی رادھا تم نے ٹھیک جانا ہے۔ میں پچھلے ہفتہ سے بیمار تھی۔ کل ہی میرا بخار اترا تھا۔ ابھی بہت کمزوری ہے۔ دو چار دنوں میں ٹھیک ہو جاؤں گی؟" جیوان نے مدھم آواز سے کہا۔

" میں بھی ماسی جی کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ کو مل آؤں۔ آپ نے تو

اس کمزوری میں اتنی تکلیف سے ملنے آئی ہیں۔ بے بی بیار تھی۔ ورنہ میں خود ملنے آتی"
رادھا نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"بے بی کو کیا ہے ؟" جیوان نے تردد ظاہر کرتے ہوئے پوچھا

"وہ تو جنم سے بیمار چلی آتی ہے۔ ہماری ساری کمائی تو ڈاکٹروں کے ہاں چلی جاتی ہے، رادھا کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے

یوں گھبرانے سے کیا ہوتا ہے بیٹی۔ بے بی ٹھیک ہو جائے گی کہو تو میں آجاؤں؟ بچّی کی دیکھ بھال کر لیا کروں گی" جیوان نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ماسی جی اس بڑھاپے میں بھی آپ سے سیوا کراتی کیا اچھی لگوں گی۔ اور پھر آپ کا بھی ایک بوڑھا سر پر۔ دوسرے آپ بیمار رہتی ہیں" رادھا نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں رادھا، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی میرے ہاتھ پیر چلتے ہیں میں تمھاری سیوا کر سکتی ہوں بندہ اگر اپنوں کے کام نہ آیا۔ تو اس کا جینا کس کام کا۔ اور تمھارے سوا میرا کون ہے جب تک جیتی ہوں تمھاری ہی سیوا کرنے کے لیے تیار ہوں" جیوان نے اپنا مدعا ظاہر کرنے کی طرف پہلا قدم اٹھایا۔

رادھا چوکنّی ہو گئی۔ اس کی کسی حِس نے بتایا کہ کوئی لڑھکتی چٹان اس کے سر پر گرنے کے لیے آ رہی ہے۔ اس لیے حفظ ماتقدم کے طور پر اُس نے فوراً جواب دیا۔
"ماسی جی آپ تکلیف نہ کریں۔ ویسے تو آپ کے آنے کی مجھے بے حد خوشی ہوتی۔ لیکن اب بے بی بیمار ہے۔ گھر کا خرچ پورا نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم یہ دو کمروں کا مکان چھوڑ رہے ہیں۔ ایسی حالت میں آپ آگئیں تو ہم آپ کو کہاں بٹھائیں گے"

رادھا نے صاف انکار کر دیا تھا۔

اور جیوان جب رادھا کے گھر سے نکلی تو اس کی روح میں غصہ اور نفرت

کا ایک بے پناہ سیلاب امڈ رہا تھا "یہ اپنے ہیں؟ انھیں اپنے کہتے ہیں؟ ان کے ہاتھ لگنے سے مرنے والے کو مکتی پراپت ہوتی ہے۔ لعنت ہے ان اپنوں پر۔ اپنے وہ ہوتے ہیں جن کے سینے کا دیا جگمگاتا ہے۔ اپنے وہ نہیں ہوتے جن سے خون کا رشتہ ہوتا ہے جن سے خاندان کی کڑیاں ملتی ہیں۔ جن سے بھانجے بھتیجے اور بھتیجی کے نام منسوب ہوتے ہیں۔ میں ان کی شکل تک نہ دیکھوں گی میں ان کے ہاتھ کا پانی بھی نہیں پیوں گی۔ یہ سمجھتے کیا ہیں؟ میں نے بنا آدمی، بنا بیٹے بیٹیوں کے زندگی کاٹی ہے بنا رشتہ داروں کی مدد کے میں زندہ رہی ہوں۔ خوش رہی ہوں، تندرست رہی ہوں۔ میں نے اپنے سکھ سکون اور سنگ ساتھ کے نئے رشتے بنائے ہیں پھر کیا یک مجھ میں یہ کمزوری کیوں آگئی کہ مرنے کے لیے میں ان احسان فراموش اور طوطا چشم لوگوں کا سہارا تلاش کرنے لگی، میں نے کیوں اپنے کو ایک بوجھ، ایک پھتر، ایک ناقابلِ قبول مہمان بنانا گوارا کیا۔ مجھے کیا ہو گیا؟ میں کن سنسکاروں کا شکار ہو گئی۔ مجھے کن روایتی خیالوں نے آدبوچا۔ میں جیسے زندہ رہی ہوں، ویسے ہی مروں گی۔ میں بنا پانی پیے مر جاؤں گی پر مجھے یہ شانتی تو رہے گی کہ میں نے کسی کا منھ نہ تاکا۔ میں نے کسی کا سہارا نہ لیا۔"

اور ایک عجیب سی طاقت نے، ایک انوکھی توانائی نے اس کے نڈھال تھکے ماندے اور بوڑھے جسم میں ایک زندگی سی بھر دی۔ اس کا چہرہ ایک اندرونی طاقت سے اس طرح دمک اٹھا جیسے دیے کی لو۔ اکسائے جانے پر بھبھک کر، نربھے ہو کر تاریکی کے سینہ کو نور سے معمور کرنے لگتی ہے اسے بیماری کا، بھوک کا، تھکن کا، بے بسی اور تنہائی کا۔ کسی چیز کا احساس نہ رہا۔ اسے محسوس نہ ہوا اس نے بازار کا وہ سارا راستہ کیسے طے کیا اور کس طرح بنا تھکے ہانپے، بنا ایک جگہ رکے اپنی کوٹھری کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ کوٹھری کا دروازہ اس وقت بند تھا حالانکہ اس کی کوٹھری کی ایک چابی بھاگونتی کے پاس رہتی تھی۔ لیکن جب وہ کوٹھری میں داخل ہوئی تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ اس کی

کوٹھری میں جھاڑو دی ہوئی تھی۔ ہر چیز قرینے سے لگا دی گئی تھی۔ بریکٹ پر اگر بتی جل رہی تھی۔ اس کا بستر جھاڑ کر نئی چادر بچھا دی گئی تھی اور سامنے چوکی پر جہاں اس کا سامان سجا ہوا تھا۔ کھانے کی تھالی کپڑے سے ڈھکی ہوئی رکھی تھی۔ اس کے کھڑاویں چارپائی کے پاس اس طرح ملا کر رکھے تھے جیسے وہ اس بات کے منتظر ہوں کہ جیوان باہر سے آئے چارپائی پر بیٹھے ذرا ستائے اور پھر جوتے اتار کر انھیں پہن کر غسل خانے میں ہاتھ منھ دھونے چلی جائے۔ کوٹھری کی ہر چیز اس لمحہ جیسے اس کے لیے سجی ہوئی اس کی راہ تکرہی تھی ایک عجیب پیار ایک عجیب اپنا پن اس کوٹھری کے لیے اس کی ہر بوسیدہ مگر اس کی اپنی چیز کے لیے اس کی روح سے امڈا اور عین اس وقت بھاگونتی کی آواز آئی۔

"ماں جی، رب کا شکر ہے تم آگئیں۔ کوٹھری کا تالا لگا دیکھ کر اور تمھیں نہ پا کر میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ بھگوان کے لیے اب ایسے نہ جایا کرو"

"بھاگونتی" اور تقریباً دوڑ کر بھاگونتی کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے جیوان بولی "آج کے بعد میں یہاں سے کبھی نہ جاؤں گی، بھاگونتی جب تک تو مجھے نہلا دھلا کر اور میرا آخری جوڑا پہنا کر مجھے اس ڈیوڑھی سے نہ نکالے گی"

زندگی کے مشاہدوں اور تجربوں نے شمشیر بہادر کو قائل کر دیا تھا کہ زندگی شطرنج کی بازی ہے اور شطرنج کی بازی وہی جیت سکتا ہے جو ٹھیک وقت پر ٹھیک چال چلے، ورنہ ماضی کی محرومیوں کا رونا روتے روتے اور مستقبل کے سپنوں کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں بند کر لینا تو زندگی کے ہاتھوں کھلی مات کھانا ہے۔ زندگی کے بارے میں شطرنج کی بازی کے عقیدے کو شمشیر بہادر نے اپنا ایمان بنا لیا تھا کیونکہ اس نے بار ہا دیکھا تھا جو لوگ وقت کی پرواہ نہیں کرتے، وقت ان کی پرواہ نہیں کرتا۔ یہ زندگی انھیں ہی سب کچھ دیتی ہے جو مستعدی سے اسے مات دیتے ہیں اُن کو نہیں، جو تقدیر کے چمتکار کا انتظار کرتے ہیں۔

شمشیر بہادر اپنی زندگی کو المیہ نہیں بنانا چاہتا تھا، اس لیے اُس نے زندگی کے ہر اس موقع سے فائدہ اٹھایا جو وقت نے اسے دیا۔ وہ پڑھنے لکھنے میں زیادہ ہوشیار نہ تھا۔ محنت کے باوجود وہ میٹرک میں دو بار۔ فیل ہو گیا تھا۔ پھر اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ میٹرک پاس نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس نے آسان راستہ چنا اور میٹرک کا جعلی سرٹیفکیٹ چار سو روپے میں حاصل کر لیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اس کے ساتھی مزید تعلیم کے لیے کالجوں میں چلے گئے، لیکن اس نے وہی ہرے رنگ کا پتّا کھیل کر ایک سا

انگریز افسر کی بیوی کی وساطت سے دلی کے ایک سرکاری ادارے میں کلرک کی نوکری حاصل کر لی۔

زندگی کے ابتدائی دور کی کامیابیوں نے اس کے ذہن میں یہ احساس بسا دیا تھا کہ یہ زندگی اسی کی ہے جو اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کی خاطر لوگوں سے چھینا جھپٹی کرتے ہیں، جو محض ایسے لوگوں سے تعلقات رکھتے ہیں، جن سے انھیں کچھ ملنے کی توقع ہو، باقی رشتے ناطے تو محض دکھاوا ہیں، نری وقت کی بربادی۔ اسی اصول کو مدِّ نظر رکھ کر شمشیر بہادر نے اپنے پتاجی کو زندگی بھر نہیں پوچھا۔ البتہ آخری دنوں میں جب وہ سخت بیمار تھے، ان کی بے حد خدمت کی۔ بھائیوں میں اس کا نمبر تیسرا تھا، لیکن وہ ان سب کو پھلانگ کر اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے دن رات جاگ کر باپ کی وہ خدمت کی کہ دوسرے بھائی پیچھے رہ گئے اور مرنے والا سب کچھ اسے دے کر چلا گیا۔

دولت، نوکری اور کچھ جھوٹ کی چمک دمک نے اس کی شادی بھی ایک امیر گھرانے میں کرا دی۔ لڑکی خوب صورت تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ جہیز میں ڈھیروں تحفے اور سامان لے کر آئی تھی۔ اس نے شمشیر بہادر کی زندگی میں پھول ہی پھول کھلا دیے تھے۔ اب اُس کی زندگی میں کیا نہ تھا۔ دولت تھی، خوبصورت بیوی تھی، اچھا مکان تھا، اتنی چھوٹی عمر میں زندگی کی ہر خوبصورتی اُسے حاصل تھی۔

لیکن اس کی لوبھی خصلت ابھی دھن دولت سے سیر نہیں ہوئی تھی۔ وہ موجودہ دولت کو محض رکھنا نہیں چاہتا تھا، بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کا اصول اب صرف پیسہ تھا۔ یہی اس کا ذہن تھا، یہی اس کا دل، یہی اس کی پوری زندگی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زندگی میں ہر شخص کی قیمت لگاتا اور موقع آنے پر اس سے اپنی قیمت وصول کرنے سے نہ چوکتا۔ اتفاقاً اس کی ہر چال ٹھیک ہی بیٹھتی جس سے اس کے عقیدوں کو اور تقویت ملتی۔

شمشیر بہادر کے اولاد بھی زیادہ نہ تھی۔ بس دو لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ بڑا لڑکا روی باپ کی طرح خوش پوش اور چرب زبان تھا۔ باپ کی طرح ہی وہ شیخی بگھارتا رہتا۔ اسے پڑھائی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ بہت مشکل سے اس نے تھرڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا تھا اور باپ کے اثر و رسوخ سے ایک سرکاری دفتر میں معمولی نوکری پر اس کا تقرر ہو گیا۔

پچھلے کئی مہینوں سے شمشیر بہادر کے ایک دوست منسا رام کے کوئٹہ سے خط پر خط آ رہے تھے۔ ان خطوں میں اس نے لکھا تھا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلے میں بھارت آنا چاہتا ہے۔ اور کیوں کہ شمشیر بہادر دلی میں ہے اور کافی بارسوخ ہے اس لیے وہ اپنی لڑکی کی شادی کے معاملہ میں اس کی مدد کا طالب گار ہے لیکن شمشیر بہادر نے اپنے دوست منسا رام کے کسی خط کا جواب نہیں دیا وہ جانتا تھا کہ منسا رام درمیانہ طبقہ کا ایک معمولی آدمی ہے اگر وہ اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلہ میں دلی آئے گا تو اس کے یہاں ٹھہرے گا، اس کی مدد لے گا، اس سے ادھار مانگے گا وہ کوئی ایسا سودا کرنا نہیں چاہتا تھا جس سے اسے کسی طرح کا نقصان ہو اس کا گھر سرائے یا دھرم شالہ تو نہیں۔ اسی لیے وہ جان بوجھ کر خاموش رہا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا دوست خط لکھتے لکھتے خود ہی تنگ آجائے گا اور خاموش ہو کر بیٹھ رہے گا۔

لیکن ایک شام جب وہ دفتر سے لوٹا تو اس کی حیرانی کی حد نہ رہی۔ منسا رام اپنی بیوی اور لڑکی کے ساتھ آ پہنچا تھا۔ ... اور وہ قلاش نہ تھا۔ وہ بے حد شاندار لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کی بیوی کی کلائیوں میں درجن درجن بھر سونے کی چوڑیاں دمک رہی تھیں۔ اس کے گلے میں جواہرات کا نیکلس تھا۔ اپنے تصور میں وہ جنھیں چیتھڑوں میں ملبوس دیکھ رہا تھا وہ ریشم میں لدے ہوئے تھے۔ منسا رام

جسے وہ دقیانوسی اور مکروہ سمجھے ہوئے تھے، بھول کر کُپّا ہو گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر سرخی ناچ رہی تھی۔ آنکھوں میں جلال تھا۔ اس کی لڑکی بے حد دل کش تھی۔ منسارام اور اس کی بیوی اور لڑکی کی ظاہری حالت نے شمشیر بہادر کو اپنا پرانا تصور بھلانے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ جب منسارام نے شکوہ کیا کہ کیا بات تھی کہ اُس نے اس کے کسی خط کا جواب نہیں دیا تو شمشیر بہادر صاف جھوٹ بول گیا۔

"کیسے خط؟" شمشیر بہادر نے بناوٹی حیرانی سے جواب دیا۔

"بھیّا میں نے تمھیں دس خط لکھے تھے لیکن ......"

"میں بچّوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے تمھارا ایک خط نہیں ملا۔ اگر ملتا تو کیا میں جواب نہ دیتا؟" شمشیر بہادر نے الٹا اپنے چہرے پر ایسا کرب پیدا کیا جیسے جھوٹ کا الزام لگائے جانے پر سچے آدمی کے چہرے پر پیدا ہوتا ہے۔

اور پھر دونوں دوست باتیں کرتے رہے بچپن کی باتیں، گاؤں کی باتیں، کویت کی باتیں، دھن کی باتیں، دل کی باتیں۔ شمشیر بہادر کا اپنے دوست کے تئیں وطیرہ اب نیا روپ اختیار کر گیا۔ اس کا روکھا پن صلیمی میں ڈھل گیا، بے رُخی خاطر تواضع میں بدل گئی۔ سارا کنبہ مہمانوں کی خدمت میں جٹ گیا۔ شمشیر بہادر نے دفتر سے چھٹی لے لی تاکہ اپنے دوست کی لڑکی کے لیے اچھا سا لڑکا ڈھونڈ سکے۔ اخبار میں اشتہار بھی دے دیا۔ چند دن کے بعد اچھے اچھے کئی رشتے آنے لگے۔ منسارام اور شمشیر بہادر اس سلسلے میں دن رات گھوم رہے تھے۔ منسارام کو ایک دو لڑکے بہت پسند آئے۔ لیکن شمشیر بہادر ہر لڑکے میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتا تھا۔ اس لیے بات وہیں رہ جاتی تھی جہاں سے شروع ہوتی تھی۔ منسارام کی چھٹی ختم ہو رہی تھی اس لیے وہ اپنی لڑکی کی شادی کے لیے بے قرار تھا۔ لیکن وہ شمشیر بہادر کے خلوص پر شک نہیں کر سکتا تھا اور اس کی خواہش کے خلاف نہ چل سکتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی بے قراری کو جبراً دبائے رہا۔

دن گزرتے رہے۔ شمشیر بہادر بدستور منا رام کو لڑکے دکھائے جا رہا تھا اور انھیں ناپسند کیے جا رہا تھا۔ شمشیر بہادر کی ناپسندیدگی کے پس پشت ایک راز تھا۔ وہ ارادہ کر چکا تھا کہ نیرا سے اپنے لڑکے کی شادی کرے گا۔ اور وہ تمام قیمتی کپڑے اور زیورات حاصل کرے گا جو منا رام دس بکسوں میں بھر کر ساتھ لایا تھا۔ اس نے وکی کو اشارہ بھی کر دیا کہ وہ نیرا کو جس طرح ہو سکے پھسلائے۔ اس سلسلے میں بے دریغ پیسا خرچ کرنے کی بھی اسے کھلی چھٹی تھی۔ اور اب وکی تھا اور نیرا۔ وکی نے دفتر جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ سارا دن نیرا کو گھما رہا تھا۔ صبح انڈیا گیٹ ہوتا تو شام کناٹ پلیس میں گزرتی دوپہر سینما میں کٹتی۔ دلی کی کوئی جگہ نہ تھی جہاں وکی نیرا کو لے کر نہ گیا تھا۔ دونوں کبھی اسکوٹر پر ہوتے کبھی ٹیکسی پر۔ وکی نیرا کو دو قدم بھی پیدل نہ چلنے دیتا۔ کبھی وہ قطب مینار کی پانچویں منزل پر ہوتے اور کبھی بدھ جینتی پارک میں۔ کبھی جمنا کا کنارا ہوتا اور کبھی لال قلعہ کے پرلطف مناظر۔ اگر کچھ کھانے کو طبیعت چاہتی تو کناٹ پلیس کی پرکیف فضا میں کسی اعلا ریسٹوراں کے نرم نرم گدّوں پر جم جاتے۔ ایک پل کے لیے نیرا وکی سے دور نہ رہتی اور نہ وکی ایک لمحہ کے لیے اسے دور ہونے دیتا۔

منا رام نے ایک بار اپنی چھٹی بڑھائی، دو بار بڑھائی۔ لیکن نیرا کے لیے کوئی مناسب لڑکا شمشیر بہادر کو پسند نہ آیا۔ وہ عجیب مخمصے میں تھا اور اب تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ آخر کون شہزادہ ہے جو شمشیر بہادر کے تصور میں ہے۔ ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔ "آخر تم کس طرح کا لڑکا نیرا کے لیے چاہتے ہو؟"

"میں ایسا لڑکا چاہتا ہوں" شمشیر بہادر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "جو نیرا کے ساتھ ایسا جچے جیسے تمھاری اس انگوٹھی میں دمکتا ہوا ہیرا۔"

"مگر ایسا لڑکا ملے گا کہاں؟"

"منا رام!" شمشیر بہادر نے حوصلہ بندھاتے ہوئے کہا۔ "تم فکر کس بات کی

کررہے ہو؟ یہ تمھارا اپنا گھر ہے، جب تک دل چاہے ٹھہرو، جو مرضی ہو کھاؤ، لڑکا میں نیرا کے لیے جلد سے جلد ڈھونڈ کر دکھا دوں گا۔"

شمشیر بہادر دقت سے کھیل رہا تھا۔ دکّی اور نیرا کے تعلقات گہرے ہوتے جارہے تھے اور یہ بات منارام اور اس کی بیوی کی نظریں آتی جارہی تھی۔ آخر ایک دن نیرا نے اشارۃً اپنی پسند کا ذکر ماں سے کر دیا۔ ماں نے منارام سے کہا۔ منارام کو بھی دکّی میں کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ اس نے بیوی سے کہا کہ وہ شمشیر بہادر کی بیوی سے دِکّی اور نیرا کی شادی کی تجویز پیش کرے۔ شمشیر بہادر اور اُس کی بیوی تو اس لمحہ کی تاک میں ہی تھے جیسے نیرا کی ماں نے تجویز رکھی، شمشیر بہادر اور اس کی بیوی نے اُسے یوں لپک لیا جیسے کھلاڑی گیند کو لپکتا ہے۔

دِکّی اور نیرا کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوگئی۔ منارام نے دل کھول کر براتیوں کی خدمت کی اور اپنی بیٹی اور داماد کو وہ سب کچھ بھینٹ کر دیا جو وہ کویت سے لایا تھا۔ اس میں جہیز کے وہ وعدے بھی شامل تھے جو بعد میں پورے کیے جانے تھے منارام بے حد خوش تھا۔ یہی کیفیت شمشیر بہادر کی تھی۔ دکی کا سیروں خون بڑھ گیا شمشیر بہادر نے بھی اپنی توفیق سے بڑھ کر اس شادی پر صرف کیا۔ اپنی بہو کے لیے ایسے ایسے کپڑے اور زیورات بنوائے تھے کہ ان کا جواب نہ تھا اس نے ساری زندگی کا اثاثہ اس سودے میں دگا دیا تھا۔ کیونکہ اس کے منصوبے کے مطابق یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا اور سب سے فائدہ مند سودا تھا۔ اُس نے اطمینان کر لیا تھا کہ منارام جو جہیز دے گا اس کی مالیت تیس ہزار سے کم نہیں ہے۔

لیکن آٹھ دن کے بعد جب منارام کے جانے کا دن آیا تو اسے محسوس ہوا کہ اُس کے ارادوں اور ارمانوں اور امیدوں کی ارتھی سجائی جارہی ہے۔

منارام کے ساتھ دِکی کا سامان بھی باندھا جارہا تھا۔ وہ نوکری چھوڑ کر

کویت جا رہا تھا۔ جہاں اسے اپنے سسر کے ساتھ کاروبار میں شریک ہونا تھا۔ عام حالات میں شمشیر بہادر بہت خوش ہوتا مگر موجودہ صورت میں وہ دکھی تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو کھو رہا تھا۔ اس کی تنخواہ کے تین سو روپے کھو رہا تھا، جو بیٹا ہر مہینے سعادت مندی سے اپنے باپ کو لا کر دیتا تھا۔ اور سب سے بڑا سرمایہ وہ جہیز کھو رہا تھا جو وکی کی شادی میں ملا تھا۔

"بیٹے تم یہ سامان کس لیے لے جا رہے ہو؟" اس نے وکی سے پوچھا۔ "تمہارے سسر کے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ کویت میں سب چیزیں ملتی ہیں۔"

مگر بیٹے نے باپ کے شاہ کو پیادے سے مار دیا۔ وہ وہاں جا کر اپنے سسر کا دست نگر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ اس جہیز کے سامان سے میں اپنی الگ گرہستی بساؤں گا۔ الگ کام کروں گا۔ میں اپنا سب کچھ اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

اگلے دن شمشیر بہادر کا پورا گھر خالی ہو گیا۔ اس کا دوست اور اس کی بیوی جا چکے تھے۔ اس کا بیٹا اور بہو بھی جا چکے تھے، جہیز میں ملے ہوئے کپڑے، تحفے، زیورات اور آرائش کا سامان جا چکے تھے۔ اس کی زندگی بھر کا وہ سرمایہ جا چکا تھا جسے اس نے شادی میں اور بہو کے زیور کپڑوں پر صرف کر دیا تھا۔ بہو بیٹا وہ بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

ایک غلط چال سے شمشیر بہادر اپنی زندگی کی سب سے بڑی جیتی ہوئی بازی ہار گیا تھا۔

پچھلے کچھ مہینوں سے سدھا کے مکان کی کھڑکی رما کی زندگی کے صبر و سکون میں، اس کی زندگی کی اخلاقی فصیل میں ایک شگاف بن کر رہ گئی تھی پہلے یہ کھڑکی بالکل ویسی ہی تھی. جیسی رما کے اپنے مکان میں. دونوں سے تقریباً ایک جیسا منظر دکھائی دیتا. لیکن پچھلے کچھ مہینوں سے سدھا کی کھڑکی کی شکل، اس کے اندر کا منظر بالکل بدل گئے تھے. کھڑکی پر اب رنگین، ریشمی پردے سرسراتے تھے اس میں سے ایک ایسا کمرہ نظر آتا تھا، جس میں فلورسینٹ ٹیوب کی روشنی تھی. ڈسٹمپر کا ہلکا آسمانی رنگ تھا، دیواروں پر خوب صورت تصاویر تھیں، فرش پر صوفہ تھا. ہر وقت لوگوں کے قہقہوں اور ریڈیو سیلون کے فلمی نغموں کی گونج تھی.

لیکن بہت مہینے، بہت برس گزر جانے پر بھی رما کے اپنے کمرے کی حالت نہ سدھری تھی وہ شاید کچھ بگڑ ہی گئی تھی، جہاں پہلے کبھی دیواروں کا رنگ سفید تھا وہاں اب زردی مائل سیاہ ہو گیا تھا. جہاں کبھی دیوار کے کونوں میں پھول لگے رہتے تھے اب جالے پڑ گئے تھے جہاں کبھی پلنگ پر نئی چادریں بچھی رہتی تھیں، وہاں اب بانس کی ٹوٹی چارپائیوں پر میلی پھٹی پرانی دریاں بچھی رہ گئی تھیں. جہاں کبھی ایک خوبصورت عورت اور ایک خوبصورت مرد کا چہرہ مسکراتا، پیار سے

ایک دوسرے کو نہارتا، اور ایک دوسرے میں لین ہوتا نظر آتا تھا، وہاں ایک تھکی ماندی کمزور عورت اور ایک پریشان حال، فکر زدہ مرد اپنے سے بیزار، ایک دوسرے سے بے اعتنا سے، خاموش، بےحس سے آتے جاتے دکھائی دیتے تھے اور ان کے درمیان ایک بچہ بھی نظر آتا تھا جو ہر چیز کے لیے ہر وقت ترستا اور روتا رہتا تھا۔

رما کو اپنے کمرے کی، اپنی زندگی کی روز افزوں بدحالی کا احساس تھا۔ دھوئیں کی طرح بڑھتی ہوئی اور روشنی کو کم کرتی ہوئی اس بدحالی کو روکنے کے لیے اس نے اور اس کے شوہر نے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ شادی کے بعد سے آج تک اس کے شوہر کو کوشش کے بعد نوکری نہ ملی۔ اس نے ہر جگہ، ہر محکمہ میں، ہر فرم میں کوشش کی تھی، لیکن نہ جانے وقت نے کیا دشمنی باندھی تھی کہ تعلیم کے باوجود بھی وہ نوکری حاصل نہ کر سکا تھا۔ ایک دو بار اسے عیوضی بھی ملی تھی۔ لیکن وہ زیادہ دن نہ چلی اور بعد میں وہ بھی پھر نہ ملی جو معمولی سا سرمایہ اس کے ماں باپ نے چھوڑا تھا۔ گھر میں جو چیزیں رما اپنے جہیز میں لائی تھی وہ دھیرے دھیرے کفایت سے چلنے کے باوجود بھی ختم ہو گئیں اور اب گھر میں بھوک مری تھی۔ تار تار کپڑے تھے۔ تنگی و تاریکی تھی۔

سدھا کے گھر میں بھی شروع شروع میں ایسا ہی تھا۔ اس کا پتی تو رما کے شوہر سے بھی کم پڑھا تھا۔ وہ صرف میٹرک تھا۔ اسے بھی نوکری نہ ملی تھی۔ اس لیے وہ بھی تنگی اور تاریکی کے دن کاٹ رہے تھے۔ رما اپنے گھر کے حالات سے گھبرا کر اپنی کھڑکی سے باہر دیکھتی تو اسے سدھا کی کھڑکی نظر آتی اور جب اس کھڑکی سے اسے اندر کا، اپنے گھر جیسا بدحالی کا نقشہ دکھائی دیتا تو جیسے اسے ایک سہارا سا مل جاتا۔ بے اطمینانی، کم مائیگی اور مفلسی کا ڈستا ہوا احساس کچھ کم ہو جاتا اور وہ صبر کر لیتی کہ غم اور غریبی نے اسے ہی نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنے عتاب کا شکار بنا رکھا ہے۔ اگر وہ مفلوک الحال ہیں، محروم ہیں تو اس میں ان کا اپنا قصور نہیں ہے، زمانے کا قصور ہے۔ غریب کی،

محنت کش کی، ایمان دار کی اس دنیا میں کوئی خبر ہی نہیں لیتا۔

اس احساس نے رما کو بڑی قوت دی تھی، اس کے اخلاقی توازن کو بڑا سہارا دیا تھا اور پتی کے لیے اس کی محبت میں بڑا اضافہ کیا تھا، غریبی اور بدحالی سے پیدا ہونے والی چڑچڑاہٹ اور بے زاری کے باوجود بھی وہ اپنے شوہر کے لیے پہلے کی طرح بلکہ پہلے سے بھی زیادہ وفادار تھی۔ گو بے کاری اور بھوک کی وجہ سے اس کے شوہر کا چہرہ سوکھ گیا تھا، رنگ کالا پڑ گیا تھا، بھبن اور مسکراہٹ عنقا ہو گئی تھی، لیکن پھر بھی اسے دیکھ کر پہلے کی طرح اس کے دل میں محبت اور جذبہ وفا ہی نہیں بلکہ ایک جذبۂ ہمدردی بھی پیدا ہوتا تھا "... بے چارے کتنی محنت کرتے، کتنے پریشان رہتے ہیں، کتنے گھل گئے ہیں۔ اگر میں نہ ہوتی، میرا بچہ نہ ہوتا تو بے چاروں کو کیا فکر ہوتی۔ اکیلا دم کسی نہ کسی طرح دم گزار لیتا۔ لیکن اتنی سی کم عمری میں بے چاروں پر ایک نہیں تین جانوں کا بوجھ آ پڑا ہے۔" اور رما اس احساس کے ماتحت اپنے پتی کی غریبی بھول جاتی۔ کمر کس کر زندگی سے ٹکر لینے کے لیے کام میں جٹ جاتی۔ وہ اپنے ہاتھ سے گھر کا سارا کام کرتی۔ اور رفصت ہوتے ہی اجرت پر دوسروں کا کام کرنے لگ جاتی۔ وہ پڑوسیوں کی ہلدی مرچ کوٹتی، ان کے کپڑے سیتی، ان کی ساڑھیوں پر سلمہ ستارے کی کڑھائی کرتی، وہ ہر وہ کام کرتی جس سے اسے کچھ بھی آمدنی ہو سکتی تھی۔ گو یہ کام کرتے کرتے اس کے ہاتھ سیاہ اور سخت ہو گئے تھے اس کے چہرہ پر خشکی آ گئی تھی۔ کمر میں درد رہتا تھا۔ لیکن وہ اپنی جگہ ثابت قدم تھی اس کے قدم ڈگمگائے نہ تھے۔ اس کی نگاہیں بہکی نہ تھیں۔

یہ اس کے قدموں کی مضبوطی اور اس کے دل کی پاکیزگی ہی تھی کہ اس نے گردھر سے اس گھڑی قطع تعلق کر لیا، جس گھڑی گردھر اس کے شوہر کو نوکری دلانے والا تھا۔ گردھر رما کے پڑوس میں رہتا تھا، اور اس کے شوہر کے پاس اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ وہ کسی بڑی پرائیویٹ کمپنی میں کسی اونچے عہدے پر تھا۔ اس نے اس کے شوہر کو عوضی پر لگوایا تھا۔

پچھلے دنوں سے وہ اس کے شوہر کو نوکری دلانے کے لیے بہت دوڑ دھوپ کر رہا تھا وہ روز ان کے ہاں آتا اور ان کی ہمت بندھاتا۔ رما کو اس کی عادتیں اور اس کی دردمندی اتنی بھائی کہ وہ اس سے کافی بے تکلف ہو گئی۔ اب گردھر وقت بے وقت گھر میں آجاتا تھا اور کبھی چائے اور کبھی کسی خاص پکوان نہ ہونے کے بہانے ان کے گھر میں کھانے کی چیزیں لے آتا۔ وہ رما کے بچّے کے لیے بھی کبھی کھلونے اور کبھی کپڑے لے آتا۔ رما یہ سب چیزیں سادے دل سے قبول کر لیتی۔ وہ سمجھتی ایک دردمند انسان ایک سچا دوست، اپنے غریب مصیبت زدہ دوست کی مدد کر رہا ہے۔ لیکن ایک شام جب یکایک گردھر نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی آنکھوں نے اس کی اصلی نیت کا انکشاف کر دیا تو رما کو اسے گھر سے نکال دینے کا فیصلہ کرنے میں ذرا تذبذب نہ ہوا اسے معلوم تھا اس لمحہ گردھر کی خواہش پوری نہ کرنے کا انجام کیا ہو گا۔ وہ جانتی تھی ان سے ایک دوست، ایک مددگار چھن جائے گا۔ اس کے شوہر کو جو نوکری ملنے والی ہے کبھی نہ ملے گی۔ لیکن وہ ایک بار بھی نہ ہچکچائی۔ جسم اور وہ محبّت جو اس کے شوہر کی امانت تھے۔ اس نے انھیں گردھر کو دینے سے صاف انکار کر دیا۔

اور اس انکار کی قیمت وہ پچھلے ایک سال سے چکا رہی تھی۔ اس کے شوہر کو نوکری نہ ملی تھی، اور گردھر نے اس کے گھر آنا یا ان کی مدد کرنا بالکل بند کر دیا تھا بہت بُرے دن آ گئے تھے۔ اس کا بچّہ پچھلے کچھ دنوں سے بڑا کمزور ہوتا جا رہا تھا اور ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ اگر اسے اچھی خوراک نہ ملی تو وہ نہ بچ سکے گا۔ اس کے باوجود بھی رما نے اپنے فیصلے پر ایک لمحہ کے لیے پچھتاوا نہ کیا تھا۔ وہ بدستور یہی محسوس کرتی تھی کہ جو کچھ اس نے کیا وہ ٹھیک تھا، درست تھا۔

لیکن ایک دن جب اس نے دیکھا کہ سدھا کے آدمی کو ایک اونچی نوکری مل گئی اس کے گھر میں ایک ساتھ دیا جل گیا۔ دیوار کو ڈسٹمپر کھڑکیوں کو روغن اور سدھا کو

ریشم اور پاؤڈر نصیب ہو گئے تو اس کے دل میں پہلی مرتبہ ایک ہوک سی اُٹھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے صبر و سکون کے پکے فرش کے نیچے سے زمین بیٹھ گئی ہے اور جس گھڑی اس کے شوہر نے آکر بتایا کہ سدھا کے آدمی کو نوکری گردھر نے دلائی ہے" اس گھڑی تو جیسے اس کے پکے فرش میں ہزاروں دراڑیں پڑ گئیں اور بے ساختہ اس کے ذہن میں یہ خیال آیا "ہائے میں نے کیا کیا"

شاید رما اس خیال کو اپنے دل سے نکال دینے میں اسی دم کامیاب ہو جاتی وہ اس صورت حال کے غیر اخلاقی پہلو پر زور دے کر اس آسودگی سے نفرت کرتی رہتی جو سدھا نے اپنا جسم دے کر حاصل کی تھی، لیکن اس کے شوہر کے ردِ عمل نے اس کے لیے ایسا کرنا مشکل بنا دیا۔ اس کے شوہر کو معلوم نہ تھا کہ گردھر اسے رما کے جسم کے عوض میں نوکری دلا رہا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس نے رما کے سامنے یہ غیر اخلاقی پیش کش کی تھی اور رما نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس لیے وہ اس مصیبت کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ گردھر نے اس کے یہاں آنا کیوں بند کر دیا۔ اس میں دلچسپی لینا کیوں چھوڑ دی۔ اس کے بجائے سدھا کے شوہر کو نوکری کیوں دلا دی۔ وہ یہی سمجھتا تھا کہ شاید اس کی یا رما کی کسی بھول۔ کسی غلطی سے گردھر ناراض ہو گیا۔ اور بنتا کام بگڑ تا گیا، ملتی نوکری چھن گئی، دن پھرتے پھرتے رہ گئے۔ اس خیال نے اس کے غم، اس کی نا امیدی اور دل شکنی کو ناقابلِ برداشت بنا دیا۔ وہ جو کبھی نہ ہارا تھا وہ جس نے اپنے کو کبھی خطاوار محسوس نہ کیا تھا، اب احساسِ شکست اور احساسِ جرم سے گھلا جا رہا تھا۔ ہر گھڑی وہ اس ادھیڑ بن میں گرفتار رہتا۔" یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ یہ سب کچھ کیوں ہو گیا؟ گردھر نے ہماری زندگی میں بہار کے پھول کھلاتے کھلاتے سدھا کی شوہر کی زندگی میں کیوں جا کھلائے؟"

اور رما جب اپنے شوہر کی یہ حالت دیکھتی تو ایک عجیب طرح کی شکست خوردگی

ایک عجیب طرح کی غیر اخلاقی ترغیب کا دھواں اس کا دم گھونٹنے لگا وہ یہی محسوس کرنے لگی، یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے اپنے شوہر کے غم کا باعث میں ہوں. میں نے ہی انھیں نوکری سے محروم کیا ہے۔ اگر میں انکار نہ کرتی، گردھر کو گھر سے نہ نکالتی۔ تو ان کی یہ حالت ہرگز نہ ہوتی۔ اور جب اس خیال کی چوٹ سے بچنے کے لیے، اپنا دھیان ہٹانے کی غرض سے کھڑکی پر آکھڑی ہوتی تو اس کی نگاہیں سدھا کے مکان کی کھڑکی پر جا اٹکتیں اور اس کھڑکی کو دیکھ کر گویا اس کے اندر تاسف کا سانپ اور زور سے پھن پھیلانے لگتا۔ صبر وسکون کی دیوار گرنے لگتی۔ آج سدھا کے گھر میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ اس کی۔ اس کی شوہر کی، اس کے بچوں کی ...... سب کی صورت کتنی بدل گئی ہے، وہ کتنے تندرست کتنے گورے چٹے اور صاف ستھرے ہو گئے ہیں۔ اور میں؟ میرا شوہر؟ میرا ننھا منا بچہ؟

اور بچے کا خیال آتے ہی اس کی حالت اور غیر ہونے لگی۔ اس کا بچہ اسکول جانے لائق ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اسے اسکول نہ بھیج پائی تھی۔ جب کہ سدھا کی چھوٹی سی بچی جو مشکل سے تین سال کی تھی کسی کانونٹ اسکول کی نرسری میں جانے لگی تھی اور اسے لینے اور چھوڑنے اسکول کی موٹر آتی تھی۔ سدھا کے بچے پڑھ لکھ جائیں گے، قابل بن جائیں گے، ———— لیکن میرے بچے...... وہ ان پڑھ رہیں گے۔ انھیں نہ اچھا کھانے کو ملے گا، نہ اچھا پہننے کو ملے گا اور نہ اچھی تعلیم ملے گی۔ وہ میرے کیے کی سزا بھوگیں گے۔ اور یہ سزا ان کی ساری زندگی برباد کردے گی۔ میں نے اپنی اور اپنے شوہر ہی کی زندگی خراب نہیں کی۔ اپنے بچے کا مستقبل بھی تاریک بنا دیا۔ رما خطرناک خیالوں کے ڈگر پر چل پڑی تھی۔ اچھے برے کا احساس محرومی اور مستقبل سے متعلق اندیشوں کے باعث دھندلا پڑ گیا تھا۔ وہ سارے مسئلہ کو عورت کی پاک دامنی کے نقطۂ نظر سے نہیں۔ ایک ماں کی بے تاب تمنا اور ممتا کے زاویے سے دیکھنے لگی تھی۔

اور حالات شاید اُس کی اِس ذہنی کیفیت کو اور شدید بنانے پر اُتر آئے تھے
انھیں دنوں اس کے لڑکے کو میعادی بخار ہوا اور انھیں دنوں اسے اس کے شوہر نے
آکر بتایا کہ گردھر کے دفتر میں ایک اور نوکری خالی ہوئی ہے اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ
گردھر سے ملا تھا۔ اس نے اس کے پاؤں پکڑے تھے، اپنی بیوی اور اپنے بچوں کا
واسطہ دیا تھا، اور التجا کی تھی کہ وہ کسی طرح اسے یہ نوکری دلا دے۔ بظاہر اس نے
وعدہ بھی کر لیا تھا کہ وہ کوشش کرے گا، لیکن اسے معلوم تھا کہ یہ محض رسمی وعدہ تھا۔
دراصل اب وہ اسے نوکری دلانا نہیں چاہتا تھا۔

اور جس طرح رما سے اس کے شوہر نے یہ سب کچھ کہا تھا اور جس بے بسی کے عالم
میں اس کی طرف دیکھا تھا، اور جس تنگ حالی کے احساس نے اسے اس وقت مغلوب
کیا تھا جب کہ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ بنا قیمتی علاج کے اس کے بچے کی جان بچانا مشکل ہے
رما کی شعوری اور غیر شعوری، ذہنی اور روحانی ہر قسم کی مدافعت کو ختم کر دیا۔ اسے
محسوس ہوا جیسے اس کا سب کچھ جا رہا ہے اور اس کو جانے سے روکنا محض اس کے ہاتھ
میں ہے۔ اس کی ایک ہاں اس ایک رضا، اس کا ایک اقرار اس کے پورے خاندان
کو زندگی اور روشنی بخش سکتا ہے اور رما نے فیصلہ کیا کہ وہ ان کو روشنی بخشے گی چاہے
اس کے دل کی وسعتوں میں اندھیرا چھا جائے۔

اور اسی شام جب اندھیرا ہو چلا تھا، اس کے گھر میں چراغ نہ جلا تھا اور سدھا
کے مکان کی کھڑکی فلورسینٹ ٹیوب کی روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ اس نے خود ہر قسم
کے احساس کو مسترد کر کے، گردھر کو آواز دی، جو اس کے مکان کی کھڑکی کے نیچے سے
گزر رہا تھا۔ گردھر نے چونک کر دیکھا سدھا کے کمرے کی کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی
رما کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

" تو آخر مزاج ٹھکانے آ گئے ؟" ایک شیطانی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر

بیدا ہوئی اور وہ پلٹ کر رما کے کمرے کے زینہ کی طرف مڑا

لیکن گردھر کی اس فاتحانہ شیطانی مسکراہٹ نے جیسے رما کے اخلاقی شعور کو طمانچہ مار کر یک دم بیدار کر دیا "یہ مسکرایا — یہ سمجھ کر کہ میں ہار گئی۔ جھک گئی بکنے پر تیار ہو گئی، لیکن کیا اس نے مجھے اتنا کمزور سمجھا ہے ؟ کیا میں غم، غریبی اور تنگی برداشت نہیں کر سکتی ؟ کیا میری عزت، میری پاکیزگی، میری عصمت اتنی بے مول ہے ؟ نہیں، جو طمانچہ اس نے مونہہ پر مارا ہے، میں اس کے مونہہ پر مار دوں گی، میں اسے بتا دوں گی میں سدھا نہیں ہوں میں رما ہوں، رما جو عورت ہے، رما جو مر جائے گی، بچے کا گلا گھونٹ دے گی۔ لیکن اپنی عزت و عصمت پر آنچ نہ آنے دے گی ؟

اور طوفان کی سی تیزی سے دوڑ کر وہ زینہ کے دروازے پر پہنچی اور اس سے پہلے کہ گردھر زینے کی آخری سیڑھی طے کرتا۔ رما نے کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی اور وہیں کواڑ سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اسے نہیں معلوم وہ کتنی دیر تک روتی رہی۔ اس کی پاکیزہ روح اس کے لمحاتی اخلاقی لغزش پر خون کے کتنے آنسو بہاتی رہی، ہاں اسے اس وقت ہوش آیا جب اس نے دروازہ پر اپنے شوہر کی آواز سنی۔ جو بڑی بے تابی سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ رما بغیر آنسو پونچھے بڑی عجلت سے اٹھی اور اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب اس نے دیکھا اس کا شوہر دیوانہ وار اندر داخل ہوا اور اندر آتے ہی اس نے رما کو اپنی باہوں میں لے لیا۔" رما مسکراؤ، مسکراؤ کہ زندگی کو آخر کار رحم آیا۔ اس نے ہم کو بھی محنتوں کے پھل سے مالا مال کیا ...... مجھے ایک دفتر میں اکاؤنٹنٹ کی نوکری مل گئی"

"سچ ؟"

"ہاں رما سچ —— اور اتنا بڑا سچ کہ اس میں جھوٹ کا شائبہ تک نہیں۔

آج مسکراؤ کہ پہلی مرتبہ ہی تمہارے لیے امید اور خوشی کا تحفہ لے کر آیا ہوں۔"

اور جھپٹ کر رما اپنے شوہر کے آغوش میں چلی گئی اور اسے محسوس ہوا، کچھ دیر پہلے اس نے جس شمع کو بجھنے سے بچایا تھا وہ بھڑک کر اتنی تیز ہو گئی ہے کہ اس کے سامنے سدھا کے کمرے کی روشن کھڑکی بالکل ماند پڑ گئی ہے

پرائی بیٹی اپنی بیٹی

کماتے تو تھے لالہ رام پرشاد مگر گھر میں راج تھا کُنتی کی ماں کا بیٹے اور بہوؤں
کی بات تو دور رہی، لالہ جی بذات خود بھی کوئی کام اس سے پوچھے بغیر نہ کرتے تھے اور یہ
کوئی نئی بات نہ تھی کنتی کی ماں نے جس دن سے اس گھر میں قدم رکھا تھا اس دن
سے اس کا سکہ بدستور چل رہا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کا اقتدار بڑھا ہی
تھا، کم نہ ہوا تھا۔ اس کی موجودگی میں گھر کے ماحول اور فضا میں ایک عجیب قسم کی گھٹن
چھائی رہتی تھی۔ کنبے کے افرادیوں دبے دبے اور سہمے سہمے دکھائی دیتے تھے جیسے انھوں
نے کوئی گناہ کیا ہو، اونچا بولنا، قہقہہ لگانا، یا کنتی کی ماں کے حکم کی خلاف ورزی کرنا
یہ کچھ ایسے کام تھے جن کے کرنے کی جرأت کسی کو نہ ہو سکتی تھی۔ گھر کا سہما ہوا سناٹا صرف
اس وقت ٹوٹتا جب وہ خود کسی بدنصیب پر برستی تھی۔ کنتی کی ماں کا رعب اور دبدبہ گھر
کی چاردیواری تک ہی محدود نہ تھا۔ وہ محلے والوں پر بھی بری طرح چھائی ہوئی تھی۔ گو
محلے والے اس کا دیا نہ کھاتے تھے، لیکن پھر بھی وہ اس سے ویسا ہی خوف کھاتے جیسا کہ
اس کے اپنے گھر والے اور اس کی وجہ تھی کنتی کی ماں جب گھر والوں پر برستے برستے
اکتا جاتی تو باہر آکر محلے والوں سے نمٹتی، گو لوگ اس کے باہر نکلتے ہی گھروں میں چلے
جاتے تھے، محلے کے بچے کسی دوسری جگہ کھیلنے کے لیے کھسک جاتے تھے۔ لیکن پھر بھی کوئی

نہ کوئی قسمت کا مارا پھنس ہی جاتا تھا۔ کوئی لڑکی اس کے قریب سے ننگے سر گزر جاتی، کوئی لڑکا بے دھیانی میں کوئی فلمی گیت گنگناتا گزر جاتا کوئی عورت باہر گلی میں کوڑا پھینکتی نظر آجاتی پھر کیا تھا، باولے بیل کو سُرخ کپڑا نظر آجاتا تھا کنتی کی ماں پھٹ پڑتی۔

"کیوں ری رانڈ، یہ چُنّی تیرے جھونڈے پر نہیں ٹک سکتی جو گلے میں پھانسی لٹکا رکھی ہے؟" "غنڈے، نکھٹو، آوارہ، یہ کیا گا رہا ہے۔ تیرے گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں؟ اگر یہ گانا ہی ہے تو ماں بہنوں کو جا کر سنا۔"

"کیوں ری یہ کوڑا میری ڈیوڑھی کے سامنے کیوں ڈالا، گھر میں ساس ہے اس کے جھونڈے میں ڈال۔ اب کے کوڑا ڈالا تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

اور اس کی گھن گرج سن کر لڑکی نہ صرف سہم کر سر ڈھک لیتی۔ بلکہ ایسے غائب ہوتی جیسے چھلاوا۔ موج میں آیا پنچھی نہ صرف چہچہانا بند کر دیتا، بلکہ دم دبا کر بھاگتا اور عورت کوڑا تو ڈال دیتی، لیکن گھبرا کر گھر کی طرف ایسی بھاگتی کہ ٹھوکر کھا کر گرنے سے بال بال بچتی۔

غرضکہ وہ سارے محلے کے لیے ہوّا تھی۔ ایسا ہوّا جسے کھائے بنا چین نہ تھا اس لیے سارے محلے والے اس کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے محتاط ہو جاتے۔ بڑے لڑکے اور لڑکیاں تو خیر گھبراتے ہی تھے۔ ننھے بچے بھی اُسے دیکھ کر ماں کی گود میں چڑھ جاتے تھے۔ کیوں کہ ان کو ڈرانے دھمکانے کے لیے مائیں اس کا نام ہی استعمال کیا کرتی تھیں۔

کنتی کی ماں بھی جب تک محلے میں ایک دو سے اُلجھ نہ لیتی، اسے چین نصیب نہ ہوتا۔ اُلجھے بنا اُسے ایسے محسوس ہوتا، جیسے اس نے کھانا نہ کھایا ہو یا اس کے معمول میں کوئی کمی رہ گئی ہو۔ یہ عادت اس کا جزو بن چکی تھی۔ ہاں ایک ہستی تھی جس پر کنتی کی ماں کے مزاج کا دستور لاگو نہ ہوتا تھا وہ تھی دمینتی۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ دمینتی

سے اس کی ایسی پٹتی تھی کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی۔ گو دمینتی لڑائی جھگڑوں میں اس کا ساتھ نہ دیتی تھی۔ لڑائی سے پہلے اور لڑائی کے بعد جو زبانی تیاریاں یا تبصرہ آرائیاں ہوتیں ان میں وہ اس کی برابر شریک ہوتی تھی۔ وہ کچھ اس سعادت مندی سے اس کی ہاں میں ہاں ملاتی تھی کہ اس کے من کو بھا گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب کنتی کی ماں کو لڑنے جھگڑنے کو کوئی نہ ملتا اور تنقید اور تاکید کے لیے موضوع ہاتھ لگتا تو وہ دل بہلا دے کے لیے دمینتی کو بلا بھیجتی اور پھر دونوں سر جوڑ کر بیٹھ جاتیں وہ محلے کی تازہ ترین خبروں کا تبادلہ کرتیں، آیندہ کی مہم کا نقشہ جماتیں اور ان بھولی بسری باتوں کی یاد تازہ کرتیں جن کا تعلق محلے والوں کی ان بہو اور بیٹیوں سے ہوتا جو اب مر کھپ چکیں یا بیٹے پوتوں کی مائیں بن چکی تھیں۔

جب تک لالہ جی جیے کنتی کی ماں کی حکومت چلتی رہی اور گھر ایک اکائی کی طرح چلتا رہا بیٹے دبتے رہے بہوئیں خدمت کرتی رہیں۔ مگر جوں ہی لالہ جی نے آنکھیں موندیں بڑا لڑکا اور بڑی بہو الگ چھو ہو گئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد چھوٹا بھی غائب ہو گیا، اب گھر میں وہ تھی اور اس کی چھوٹی بیٹی کنتی۔ مکان کے جو کمرے بہوؤں اور بیٹوں نے چھوڑے تھے وہ کنتی کی ماں نے کرایے پر اٹھا دیے۔ کچھ اثاثہ تو لالہ جی نے چھوڑا ہی تھا اور کچھ کرایہ آنے لگا اس طرح گزر کا اچھا خاصا سامان ہو گیا، لالہ جی کی موت اور بیٹوں کے چلے جانے سے اس کی شغلہ سامانی میں رتی بھر کی کمی پیدا نہ ہوئی بلکہ سے کچھ اور فارغ البال آزاد اور بے فکر بنا دیا۔ وہ اسی جوش سے اسی انداز سے محلے والوں سے الجھتی، لڑتی جھگڑتی چلی آ رہی تھی

لیکن لالہ ر، اور بہو بیٹیوں کے چلے جانے کی وجہ سے اس کے گھر کی زندگی میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا۔ گھر، اب اس کی بارہ سالہ لڑکی کنتی رہ گئی تھی جو اسکول میں پڑھتی تھی۔ اب جب اس کے مزاج میں خارش اٹھتی تو اس کے گھر میں کنتی کے علاوہ اور کوئی

نظر نہ آتا وہ اپنا نزلہ کنتی پر گرانے کی کوشش کرتی۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ کنتی بیٹے کی بہوؤں کا بدلی نہیں ہے وہ اس کی تسکین کا سامان نہیں بن سکتی کیونکہ وہ اس کی طرح تند خو تیز اور تنک مزاج ہے۔

اور یہ تھا بھی صحیح، کہ کنتی اپنی ماں کی بیٹی تھی۔ بیٹی میں ایک تو ماں کا خون تھا۔ دوسرے ماں نے اسے خاص اپنے طور طریق پر تربیت دی تھی۔ گھر کی بہوؤں سے لڑنے اور باہر محلے والوں سے جھگڑا مول لینے کے لیے اس نے دراصل کنتی سے ایک آلہ کا کام لیا تھا اس نے شروع ہی سے اُسے اپنے رنگ کی تعلیم دی تھی "دیکھ باہر سے مار کر آنا۔ پٹ کر نہ آنا، کوئی ایک کہے تو دس سنانا، بھابی اگر گلاس بھی اٹھانے کو کہے تو اٹھا کر نہ دینا اور ہاں ذرا کان لگائے رہنا وہ جو باتیں کریں اس کی خبر مجھے دینا۔" اس کی تعلیم کا اثر یہ ہوا تھا کہ چھوٹی سی عمر سے ہی اس کی شخصیت بڑی مونہہ زور ہو گئی تھی اور وہ بات بات پر جھگڑا کرتی۔ بچوں کو مارتی، عورتوں کو گالیاں دیتی۔ گھر میں وہ بھابیوں کی جان کا روگ ہی بن گئی تھی۔ وہ انھیں ایک کی دس سناتی، تنکا توڑ کر نہ دیتی بھائیوں اور ماں سے چغلی لگاتی اور سی آئی ڈی کی طرح اُن کی باتوں پر کان لگائے رہتی، اس کی ان حرکتوں پر گھر یا باہر کے جس آدمی نے اعتراض اٹھایا اس کو کنتی کی ماں نے بھگتا۔ وہ بنا کچھ سنے اُلٹا شکایت کرنے والے پر بپھر پڑتی۔ "ارے تمہارے پانچ پانچ سانڈنیاں پرائے کھیتوں میں مونہہ مارتی پھرتی ہیں، ان کا کچھ نہیں۔ میری ایک بیٹی تمھیں پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی تم اُسے رانڈ کی بیٹی سمجھ کر دبانا چاہتے ہو۔ ارے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھو تو آنکھ نکال لوں گی۔ چھاتی پر چڑھ کر خون پی جاؤں گی۔

کنتی کی جارحانہ کارروائیوں اور اس کی ماں کی خون آشام حمایتوں کا اثر یہ ہوا کہ ماں کی طرح بیٹی بھی محلے والوں کے لیے ایک مصیبت بن گئی۔ مرد اور عورتیں، لڑکے لڑکیاں اس سے اس طرح بچ کر رہنے لگے جیسے سانپ کے بچے سے۔ وہ اسے لڑائی

کا کوئی موقع نہ دیتے۔ بچے تو اسے آتا دیکھ کر کھیل ہی بند کر دیتے۔ اس طرح کچھ عرصے بعد یہ ہونے لگا کہ کنتی کو ساتھی نہ ملتا۔ وہ باہر جاتی اور کچھ دیر میں بیزار ہو کر گھر لوٹ آتی اور وہاں اس کی تشنہ فطرت ماں سے انتقام لیتی، وہ کھانے پر، پہننے پر، اٹھنے بیٹھنے پر، ماں سے جھگڑنے لگتی دراصل وہ لڑکر، اپنے اندر کی گھٹن خارج کرنے کے بہانے تلاش کرتی پھرتی۔ وہ ہر چیز میں عیب نکالتی "یہ دال کیوں بنائی یہ سبزی کیوں پکائی۔ میری شلوار کے لیے کیسا کپڑا لائی" کچھ عرصے بعد جب یہ سب کچھ طبیعت کا حبس دور کرنے کے لیے ناکافی محسوس ہونے لگا تو اس نے جھگڑنے کے بجائے حکم عدولی کرنا شروع کر دی، اب وہ ہر اس کام کو کرتی جو اس کی ماں کو ناپسند ہوتا ہر اس طریق کو اپناتی جس کی مخالفت اس کی ماں کرتی، اب وہ جان بوجھ کر اپنا سر ننگا رکھتی۔ دوپٹہ گلے میں ڈالنا تو درکنار بنا دوپٹہ کے پھرتی۔ دوسروں کے سامنے شلوار کے پائنچے اٹھا کر خواہ مخواہ پنڈلیاں کھجانے لگتی۔ جہاں لڑکے کھڑے ہوتے جان بوجھ کر جا کھڑی ہوتی۔

شروع شروع میں کنتی کی ماں نے گالی گفتار اور لات دھکوں سے اسے روکنے کی کوشش کی۔ وہ اسے گالیاں دیتی۔ اس کے بال پکڑ کر کھینچتی۔ اسے مکوں اور لات سے مارتی۔ مگر کنتی نہ صرف نہ مانتی بلکہ دوگنے جوش و خروش سے وہی حرکتیں پھر کرتی اس کی فطرت میں کانٹوں کے جو بیج اس نے بوئے تھے اُگ آئے تھے اور اب اس کے کاٹے بھی نہ کٹتے تھے۔ ایک دفعہ تو اس نے کنتی کے دوپٹہ نہ لینے پر اسے اتنا مارا کہ اس کے ہاتھ دکھ گئے اور اس کی سانس اکھڑ گئی مگر کنتی بندی ٹس سے مس نہ ہوئی، ایک آنسو نہ گرایا اور برابر کہتی رہی "مار لو جتنا جی چاہے مار لو۔ میں دوپٹہ نہیں لوں گی نہیں لوں گی مار لو" اور جتنا اس کی ماں اسے مارتی گئی تھی اتنا ہی تسکین کا ایک عجیب و غریب احساس اس کے چہرے پر پھیلتا چلا گیا تھا اور بڑے خوف کے ساتھ کنتی کی ماں نے محسوس کیا، "وہ زیر نہ ہو سکے گی۔ وہ اچل اٹل رہے گی وہ ہارے گی نہیں مجھے ہرا کر رہے گی"

اور خوف کی شکست کی، بے بسی کی ایک جھرجھری پہلی مرتبہ اس کے وجود میں پھیلی تھی" مجھے کسی نے نیچا نہ دکھایا، لیکن میری بیٹی مجھے نیچا دکھا کر رہے گی۔ میرا خون ہی مجھے ہرا کر رہے گا۔"

اور دراصل یہی خوف تھا جس کی وجہ سے کنتی پر اس قدر سختی سے قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کنتی اس کی زندگی کی ہنگامہ آرائی کی جڑ کاٹ رہی ہے اس سے اس کا محبوب ترین مشغلہ چھین رہی ہے اس کا وہ مونہہ بند کر رہی ہے جس کے ذریعے وہ دوسروں پر تنقید و تبصرہ آسانی کرتی اور حکم چلاتی ہے، اگر وہی بنا دوپٹے کے پھرے گی۔ اگر وہی اونچے پائنچے کی شلوار اور نیچے گلے کے کُرتے پہنے گی، اگر وہی گھوڑیوں کی طرح کودے گی اور لونڈوں سے ہاہا ہی کرے گی تو وہ دنیا کی بیٹیوں کو کیسے ٹوک سکے گی؟ ان کی بے حیائی کے چرچے کیسے کر سکے گی؟ ان کے چال چلن کے متعلق کیسے شبہات کا دھڑلے سے اظہار کر سکے گی۔ اگر وہی اس سے اونچے لہجے میں بولے گی اور اسے ایک کی دس سنائے گی تو وہ دنیا کو کیسے زیر رکھ سکے گی۔

کُنتی کی ماں کو بیٹی کے مستقبل سے زیادہ اپنے مستقبل کی فکر ستا رہی تھی۔ لیکن کانٹوں کی باڑ جتنا کاٹو اتنا ہی بڑھتی ہے۔ کنتی کی ماں نے کنتی کو جتنا قابو کرنے کی کوشش کی وہ اتنا ہی بے قابو ہوتی چلی گئی۔ اب وہ جوان ہو گئی تھی، اس کا جسم پوری طرح بھر گیا تھا، اس کی ماں نے چاہا کہ وہ اچھے گھرانے کی بیٹی کی طرح دب ڈھک کر رہے لیکن کنتی کی شخصیت میں ماں کی جارحانہ شخصیت کے عناصر داخل ہو چکے تھے وہ اس کی تصویر بن کر اس کے سامنے ڈٹ گئی۔

انہیں دنوں محلے میں ایک نیا کنبہ آکر بسا، اس کنبے نے تو کنتی کی ماں کو تبصرے اور تنقید کے موضوعات کا ایک بیش بہا خزانہ عطا کیا، اس کنبے میں چار لڑکیاں تھیں۔ ایک سے ایک حسین اور ایک سے ایک فیشن پرست، بڑی کی عمر کوئی اٹھائیس کے قریب

تھی۔ اور سب سے چھوٹی کی سترہ کے قریب۔ شادی ایک کی نہ ہوئی تھی، لیکن بقول کنتی کی ماں۔ کے "تم انھیں کنواری کہتی ہو۔ اری یہ تو بیاہیوں کو پاٹھ پڑھا دیں۔"

ان میں سے تین نوکر تھیں اور چوتھی نے ابھی ابھی میٹرک پاس کیا تھا، لیکن چاروں رہتی ایک ٹھاٹھ سے تھیں اور ان کا باس اور ان کا رنگ ڈھنگ دیکھتے ہی کنتی کی ماں نے اور سب کام چھوڑ کر ان کا ذکر سنبھال لیا تھا۔ اب دن رات وہ انھیں کے چرچے کرتی رہتی۔ چونکہ ان لڑکیوں کے مقابلے میں باقی محلے والوں کی لڑکیاں قدامت پرست ہی نظر آتی تھیں اس لیے دمینتی کے علاوہ محلے کی دوسری عورتیں بھی کنتی کی ماں کے گرد جمع ہو جاتیں اور پھر جو تنقید اور تبصرے کی محفل گرم ہوتی تو سب کنتی کی ماں کی جدّت طبع اور اظہار کی ندرت کی داد دیتیں۔

"اری تم نے ان بے حیاؤں کو دیکھا۔ رنڈیوں نے بھی ایسے سرخ پوڈر نہ لگائے ہوں گے جیسی یہ لگائے ہیں۔ سنا ہے گھنٹوں بیٹھ کر سنگار کرتی ہیں، تل کی بات چھوڑو سنا ہے ان کی بھویں بھی نقلی ہو دیں ہیں اور ان کے بلاؤز دیکھے ہیں؟ پیٹ بھی ننگا کمر بھی ننگی اور سامنے سے ایسا پان کاٹیں ہیں کہ مانو اُبلا پڑے ہے۔"

"لیکن ماں جی ان کے ماں باپ کچھ نہیں کہتے؟" ایک پڑوسن لقمہ دیتی

"وہ کیا کہیں اور کیوں کہیں، وہ بھی تو جانیں ہیں کہ کمائی اس بات کی کر کے لادیں جسم کو دبے ڈھک کر رکھیں تو کون ہتھیلی پر ٹکا رکھے۔"

"تو ماں جی کیا سچ یہ اس بات کے پیسے لادیں ہیں؟" دوسری عورت بھڑکتی آگ میں سلاخ مارتی اور کنتی کی ماں اور تیزی سے جل اٹھتی۔

"د مجھ سے پوچھے ہے۔ ارے ان کے جسم دیکھو۔ کیا یہ کنواریوں کے جسم ہیں۔ اری کہیں کنواریوں نے ایسے انی چھوڑے ہیں۔ یہ سب بگڑی ہوئی ہیں۔"

"یہ تو ہے ماں جی۔ پر اُن کا کیا دوش۔ ماں باپ نے ہی بگاڑا ہے نا؟"

"اور کیا بیٹی جب بگڑے گی، ماں باپ کی ڈھیل سے بگڑے گی ذرا میری بیٹی تو ایسے چلن سیکھ کر دیکھ لے۔ ٹانگ توڑ دوں۔ زمین میں گاڑ دوں۔"

اس کنبہ کی وجہ سے کنتی کی ماں کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ پہلے عورتیں ڈرتی تھیں کیونکہ وہ خود نشانہ تھیں۔ لیکن اب کنتی کی ماں کے غیض وغضب کا نشانہ وہ کنبہ بن گیا تھا۔ اس لیے عورتیں لذت لینے اور اپنی جذباتی تسکین کی خاطر زیادہ وقت کنتی کی ماں کے یہاں بیٹھی رہنے لگیں۔ انھیں کنتی کی ماں بہت اچھی لگنے لگی اور کنتی کی ماں ایک ہیرو کی طرح اپنی تنقید میں روز بروز ضبط واحتیاط اور شائستگی اور شرافت کی حدیں عبور کر کے خراج تحسین حاصل کرنے لگی۔

لیکن ایک دن یکایک کنتی کی ماں کو زور کی ٹھوکر لگی۔ اس نے دیکھا کنتی ان لڑکیوں سے کھڑی بات کر رہی تھی۔ اس نے کنتی کو بلا کر ڈانٹا، لیکن کنتی نے کوئی پرواہ نہ کی وہ ان سے ملتی رہی۔ ان کے ہاں آتی جاتی رہی، کیونکہ وہ پڑھی لکھی مہذب لڑکیاں اُسے بہت پسند تھیں اسے ان میں کوئی عیب نظر نہ آیا تھا، انھیں ملنے سے اُسے دلی راحت محسوس ہوتی تھی اور کچھ دنوں بعد ایک دن جب وہ اپنے گھر لوٹی تو کنتی کی ماں نے دیکھا اس نے دو چوٹیاں کر رکھی تھیں۔ چہرے پر پاؤڈر تھا اور ماتھے پر بندی تھی اور ہونٹوں پر ہلکی ہلکی لپ اسٹک تھی۔ غصہ میں آکر اس نے کنتی کی چوٹیوں کو پکڑ لیا۔ "اری بے شرم تو ان کے قدموں پر چلنے لگی۔" اس نے اسے دیوار کی طرف دھکا دیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے دیکھا کنتی وہیں کھڑی تھی۔ الٹا وہ دوسری طرف کی دیوار سے جا ٹکرائی تھی غصے میں حملہ کرنے کے لیے وہ کنتی کی طرف بڑھی۔ لیکن یکایک اس کے قدم رُک گئے۔

"اگر مجھے ہاتھ لگایا تو مجھ سے بُرا نہ ہوگا۔ میں اب بچی نہیں ہوں جو میرے جی میں آئیگا کروں گی۔ جس سے جی کرے گا ملوں گی، تم بیچ میں بولنے والی ہو کون؟"

"تیری یہ مجال؟" غصے میں باؤلی ہو کر وہ اس پر ٹوٹ پڑی۔

لیکن اگلے لمحے وہ بے دست و پا تھی۔ اس کا جسم بیٹی کی مضبوط جوان ہاتھوں میں قید تھا۔

"میں نے کہہ دیا مجھے ہاتھ لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"تو ان بیسواؤں کے ہاں جائے گی؟"

"ہاں"

"تو میری ناک کٹوائے گی؟"

"ناک نہیں زبان۔ تمہاری زبان بہت لمبی ہو گئی ہے اس میں بہت زہر بھر گیا ہے وہ آواز نہیں نکالتی ڈستی ہے، اس لیے اس کا کٹ جانا ہی بہتر ہے۔"

"اور میری زبان تو کاٹے گی؟"

"وہ اپنے آپ کٹ جائے گی۔ میں اب تمہارے پاس گھر میں بیٹھ کر دنیا بھر کی تنگ نظری کے تانے بانے نہیں بنوں گی۔ میں تمہاری طرح دنیا کے راستے میں کانٹوں کی باڑ بن کر کھڑی نہیں ہوں گی۔ میں ان لڑکیوں کے ساتھ جایا کروں گی۔"

"کہاں؟" خوف زدہ ہو کر، آنکھیں پھاڑتے ہوئے کنتی کی ماں نے بیٹی سے پوچھا۔

"ٹائپ سیکھنے۔ ان کی چھوٹی لڑکی ٹائپ سیکھنے جاتی ہے۔ ٹائپ سیکھ کر وہ نوکر ہو جائے گی۔ میں بھی ٹائپ سیکھوں گی۔"

"اور نوکر ہو جائے گی؟" اس نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں" کنتی کے لہجے میں ارادے کی قوت تھی۔

"لیکن دنیا مجھے کیا کہے گی؟"

"جواب تنگ دنیا کو تم نے کہنا ہے۔ جو کھوٹے سکے تم نے دنیا کی گود میں ڈالے ہیں وہ دنیا اب تمہاری گود میں ڈالے گی۔"

"لیکن دنیا تو تجھے بھی نہ بخشے گی۔ وہ کہیں گے تو بھی ان لڑکیوں کی طرح آوارہ

ہو گئی ہے ۔"

"وہ کچھ بھی کہیں مجھے پرواہ نہیں ، لیکن تمھیں ضرور معلوم ہو جائے گا وہ لڑکیاں جو کام کرتی ہیں اتنی بری نہیں جتنی تم سمجھتی ہو۔ اپنی بیٹی کو دیکھ کر تمھیں دنیا کی بیٹیوں کا اصلی روپ نظر آجائے گا ۔

یہ کہہ کر اس نے اپنی ماں کو باہنوں کی گرفت سے آزاد کر دیا اور کنتی کی ماں بنا کچھ کہے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے کواڑ بند کر لیے ۔ اگلے دن جب عورتیں تنقید و تبصرہ کے لیے جمع ہوئیں تو ان کی حیرت کی حد نہ رہی، جب انھوں نے سنا۔ کنتی کی ماں کہہ رہی تھی بہن کنواری کنیاؤں پہ الزام لگا کر کیوں پاپ کماویں ؟ آخر سرکاری دفتر میں کام کرتی ہیں کسی ایسی ویسی جگہ تو نہیں کرتیں اور بچہ کماتی ہیں تو فیشن کرتی ہیں اور فیشن کرنے کے یہ دن نہیں تو کب آئیں گے ! اس لیے میں تو یہی کہوں ہوں کہ بہن پرائی بیٹی کی بات اپنی بیٹی سمجھ کر کرنی چاہیے ۔"

کتنی بلندی کتنی پستی

مُرلی دھر کو جہیز لینے دینے سے بے حد نفرت تھی۔ جب وہ کسی لڑکے یا لڑکی کی شادی میں شریک ہوتا تو اسے جہیز دیکھ کر بے حد کوفت ہوتی۔ یک لخت اس کے ذہن میں اس رسم کی بدولت ہونے والے ایسے ابھرنے لگتے۔ ان میں آن میل جوڑوں کی قطاریں ہوتیں، قبل از وقت بوڑھے ہونے والے والدین کے مجسمے ہوتے یا جوان لڑکیوں کی صورتیں ہوتیں، جو منہ مانگا جہیز نہ دیے جانے کی وجہ سے کسی بوڑھے کھوسٹ کے پلے باندھ دی جاتیں، یا کوئی ایسی غیر سماجی حرکت کر بیٹھتیں کہ زمانہ کانپ اٹھتا یہی وجہ تھی کہ اکثر ماں باپ بیٹیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے ساتھ وہ سلوک نہ ہو پاتا جو لڑکوں کے ساتھ لوگ روا رکھتے۔ نالائق سے نالائق بیٹے آنکھوں پر بٹھائے جاتے لیکن بیٹیوں کو پرایا دھن سمجھ کر جائز حقوق سے بھی محروم رکھا جاتا۔ یہ تھا زمانے کا دستور۔ اس مہذب اور متمدن دور کا چلن، جب کہ دنیا کے کونے کونے میں ترقی کی بلندیوں کو چھوا جا رہا تھا۔

اور جہیز سے اس قدر نفرت مرلی دھر کے سلسلہ میں سُنی سُنائی باتوں کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس ذاتی تجربہ کی بنیاد تھی جس سے اس کے والدین کو گزرنا پڑا تھا۔ اسی جہیز کی لعنت کا نتیجہ تھا کہ اس کی بڑی بہن کو ایک ادھیڑ عمر والے کے پلّے باندھ دیا

گیا تھا اور اس کی چھوٹی بہن پڑوس میں بسنے والے ایک نوجوان چھوکرے کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور جب وہ لوگوں کو اپنی بہنوں کے بارے میں باتیں کرتے سنتا تو یہ ذہنی اضطراب اور بڑھ جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر وہ سوچا کرتا اگر بھگوان بیٹی دے تو دھن بھی دے اور اس مہنگائی کے دور میں جب کہ زندہ رہنا ہی مشکل تھا لڑکیوں کے جہیز کے لیے دھن آتا بھی کہاں سے؟ شاید ان حالات کا رنگ تھا کہ آئے دن ایسے واقعات ہوتے رہتے تھے کہ برات آئی لیکن خاطر خواہ جہیز نہ ہونے کے سبب بغیر دلہن کے لوٹ آئی یا کسی لڑکی نے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر اپنے باپ کو جہیز نہ دے سکنے کی بے عزّتی سے بچا دیا۔

اور ان واقعات سے متاثّر ہو کر مرلی دھر نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ شادی کریگا تو ہرگز ہرگز جہیز قبول نہ کرے گا۔ وہ کسی نہ کسی باپ کی مشکل کا حل بن کر دکھائے گا کہ اس دنیا میں جہاں لوبھی اور لالچی انسان ہیں وہاں اس جیسے فراخ دل بھی ہیں جو دھن دولت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ اپنے عمل سے، اپنے کردار سے ایسی مثال چھوڑ جائے گا کہ آنے والی نسلیں اس پر فخر کریں گی۔ وہ عورت کی عظمت کو بڑھانے کے لیے تن من دھن سے دنیا میں کام کرے گا۔ وہ ایسا انسان بن کر دکھائے گا جو اپنے زمانے کا رُخ بدل سکتا ہے۔

اور مرلی دھر نے اتنا ہی بلند آدرش سامنے رکھ کر زندگی میں قدم رکھا تھا۔ بی ایس سی پاس کرنے کے بعد اس نے نوکری نہ کی بلکہ اپنے شہر کے "ناری سیوا نکیتن" کے کام کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ وہ لگاتار تین سال تک پورے صدق اور خلوص سے یہی کام کرتا رہا۔ کتنی ہی گمراہ لڑکیوں کو وہ ٹھیک راستے پر لے آیا تھا، پانچ چھ بد چلن عورتوں کو بھی لگاتار کوششوں سے اس نے نیک زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی تھی۔ جنتا کی سیوا میں کتنا آنند تھا وہ بس خود ہی جانتا تھا، لیکن وہ اس کام میں زیادہ دیر

تک من نہ لگا سکا، کیوں کہ ذاتی تجربہ سے اس نے جان لیا تھا کہ خدمت خلق اس کے بس کی بات نہیں یہ تو محض اعزازی کام ہے۔ اس کا پیٹ روٹی مانگتا تھا، اس کے تن کو کپڑے کی ضرورت تھی اور ان چیزوں کے علاوہ اس کے بوڑھے والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں کی امداد طلب آنکھیں بار بار لجاجت سے اس کی جانب تکتی رہتیں۔ ان مشکلوں سے گھبرا کر اس نے اپنے ذاتی اور ذہنی لطف کو خیر باد کہہ کر اپنی آرزوؤں اور امنگوں کے حسین دراج محل کو مسمار کر دیا تھا، اب وہ مقامی کالج کے شعبہ سائنس میں بطور ڈیمونسٹریٹر نوکر ہو گیا تھا۔

نوکری کرنے کے بعد بھی زندگی کے بارے میں اس کے نظریہ میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ شادی کے سلسلہ میں بھی اس کے خیالات بدلے نہ تھے وہ محض محبت کی شادی کا قائل تھا اور جب ایک دو آدمیوں نے اس سے شادی کے سلسلہ کی بات چیت کی اور زیادہ سے زیادہ جہیز دینے کا لالچ دیا تو اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو زندگی کی منڈی میں فروخت کرنا نہیں چاہتا۔ وہ شادی کرے گا۔ ضرور کرے گا۔ لیکن وقت آنے پر اور اچھی لڑکی ملنے پر۔ وہ ایسی لڑکی سے شادی کرے گا جسے وہ بھی چاہتا ہو اور جو اسے بھی پسند کرتی ہو۔ امیر غریب کی کوئی قید نہ تھی۔ لینے دینے کا کوئی سوال نہ تھا۔

اور مرضی کے مطابق لڑکی کی تلاش کوئی خاص مشکل کام بھی نہ تھا۔ کالج کی رنگین فضا میں نت نئے چہرے آتے اور چلے جاتے۔ ان چہروں کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے اس کے پاس کتنا وقت تھا اور کتنے سنہرے موقعے، اس نے دھیرے دھیرے سب کچھ دیکھتے دیکھتے جان لیا تھا کہ کالج تو محض وقتی رومان پسندی کی سٹیج ہے جس میں سنجیدگی نہیں۔ یہ زرق برق لباس میں سجے سنورے جسم، نظروں کے تبادلے کے سوا کچھ نہیں۔ یہ چمک دمک، یہ بھڑک بھڑک کم سنی اور عبوری دور کا تقاضا ہے۔ اس کے پس پشت سنجیدگی اور

بنجگی کی ذرا سی جھلک بھی نہیں۔ اور کالج کے طلباء اور طالبات میں کھیلے جانے والے محبت کے کھیل۔ سپنوں میں دیکھے جانے والے سنظر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور وہ اس سستی رومان پرستی میں کھونا بھی نہ چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنا دامن ان چیزوں سے بچائے رکھا۔

اور شاید وہ اس رومان پندی سے اپنا دامن بچاتے ہی رکھتا اگر اس کی زندگی میں رما نہ آتی۔ رما بی ایس سی فائنل کا امتحان دے رہی تھی۔ رما محض جوان نہ تھی بلکہ دل کشی کا ایک نادر نمونہ تھی۔ اس کی کنول جیسی آنکھوں اور گلابی چہرے میں کشش تھی کہ دیکھنے والے بس دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ وہ نت نئے نئے لباس پہن کر آتی۔ جب وہ کار سے باہر نکلتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے چاند بادلوں سے نکل آیا ہو۔ رما حال ہی میں کسی دوسرے کالج سے آئی تھی وہ تن تنہا گھومتی رہتی۔ عموماً اپنے خالی وقت شعبہ سائنس کی لیبارٹری میں ہی گزارتی۔ اس نے اپنی طویل بیماری کی وجہ سے کچھ پریکٹیکل نہ کیے تھے۔ ان تجربوں کو اب مکمل کرنے کے لیے وہ لیبارٹری کا طواف کرتی رہتی، اور یہیں سے وہ مرلی دھر کی زندگی میں داخل ہونے لگی۔ مرلی دھر لاکھ نہ چاہنے پر بھی اسے دیکھے بغیر نہ رہ سکتا۔ وہ کچھ اس طرح مسکراتی، ہنسی بولتی کہ مرلی دھر سب کچھ بھول جاتا۔ نہ اسے اپنی سدھ بدھ رہتی نہ گردو پیش کا خیال رہتا۔ اور اب وہ اکثر گھر سے کالج اور کالج سے گھر رما کی کار میں جاتا۔ سنیما بھی اب وہ اکیلا نہ دیکھتا۔ رما اس کے پہلو میں ہوتی دھیرے دھیرے وہ اس کے خوابوں کی تعبیر بن گئی۔ مرلی دھر رما کو اپنی رفیقہ حیات کے روپ میں دیکھنے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ لیکن اس کا یہ رنگین سپنا اس گھڑی تار تار ہو گیا جب مرلی دھر کے سوال کے جواب میں رما نے صاف کہہ دیا کہ وہ مرلی دھر سے دوستی تو کر سکتی ہے، شادی نہیں، شادی تو وہ اپنے خاندان کے معیار کے کسی خاندان میں کرے گی۔

اس کی عنایتوں سے امتحان پاس کر کے رمبا چلی گئی لیکن مرلی دھر کے سینے میں زہر کا ایک بجھا خنجر گھبو کر چھوڑ گئی۔ اس نے نہ صرف اس کی محبت کا خون کر دیا بلکہ اس کی خودداری کو بھی مجروح کر دیا۔ وقت گذرنے پر بھی وہ یہ نہ بھلا سکا کہ رمبا نے اس سے اس لیے شادی نہ کی کیوں کہ وہ دولت مند اور صاحب جائداد نہ تھا۔

اس دن سے اسے امیر لڑکیوں سے نفرت ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا وہ کسی امیر آدمی کی بیٹی کو موہنہ نہ لگائے گا۔ وہ کسی ایسی غریب لڑکی کو اپنی محبت کا تحفہ پیش کرے گا جو دولت کی بجائے دل کی قدر کرتی ہو اور کچھ دن بعد اسے سادھنا مل گئی۔ سادھنا ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ وہ مرلی دھر کے پڑوس میں رہتی تھی۔ سادھنا کا باپ کسی دفتر میں معمولی کلرک تھا۔ بہت بچے ہونے کی وجہ سے ان کے گھر کی گزر بھی مشکل سے ہوتی تھی اسی لیے وہ اپنی بیٹی کو کالج میں پڑھانے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ لیکن ذہین لڑکی کو وہ پڑھنے سے نہ روک سکتے تھے۔ انھوں نے اس سلسلے میں مرلی دھر سے بات چیت کی تھی۔ مرلی دھر نے ان کی بے حد مدد کی تھی۔ سادھنا کی فیس معاف کروادی تھی اسے کچھ کتابیں کالج لائبریری سے لے دیں اور باقی کتابیں اِدھر اُدھر سے فراہم کر دی تھیں۔ سادھنا عام لڑکیوں کی طرح شوخ اور تیز طرار نہ تھی۔ اس کی سادگی میں حسن تھا اور حسن میں معصومیت وہ اسے نسائیت کی معراج دکھائی دی۔ شرم وحیا کی پتلی جب بات چیت کرتی تو اس کے موہنہ سے پھول جھڑتے۔ بس ان ہی اداؤں نے، اسی دلکشی نے مرلی دھر کا من جیت لیا تھا۔ ارادی اور غیرارادی طور پر وہ سادھنا کی جانب جھکنے لگا۔ وہ اسے ایک آدرش لڑکی محسوس ہوئی، جو خوبصورت ہونے پر محنتی بھی تھی، غریب ہونے پر مہذّب اور باشعور بھی تھی۔ اور ایسی رفیق حیات کا مل جانا کسی معجزہ سے کم نہ تھا اس خیال کو مدِّ نظر رکھ کر اس نے سادھنا کی من اور دھن سے سیوا کرنے سے احتراز نہ کیا۔ اور اس خدمت میں اسے بے حد لذّت آئی۔ وہ دل سے جو کام کرتا اسے اس سے

بے حد خوشی ملتی ۔ اور خوشی بھی تو زندگی کا ایک مقصد ہے ۔ دھیرے دھیرے سادھنا مرلی دھر کی زندگی میں چھانے لگی اور سادھنا بھی مرلی دھر کو بُرا نہ سمجھتی ۔ وہ اس کے ساتھ آنے جانے سے بالکل نہ جھجکتی ۔ نہایت بے باک ہو کر وہ اس کے گھر آتی جاتی ۔ مرلی دھر بھی جب چاہتا سادھنا کے گھر چلا جاتا ، اور وہاں پہروں بیٹھا رہتا ۔ اگر اس کے جی میں آتی تو وہ سادھنا کو کسی نہ کسی بہانے سے اپنے گھر بُلا بھیجتا ۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ مرلی دھر سادھنا کو اپنی زندگی کا جزو سمجھنے لگا ۔ اور اس خیال کو اور تقویت مل گئی تھی جب سادھنا کے باپ نے ایک بار اسے زندگی میں لینے کی بات بھی کی تھی ۔ لیکن سادھنا ان باتوں سے بالکل بے خبر تھی وہ اپنی دھن میں پڑھے جا رہی تھی ۔ دن رات پڑھتی رہتی اور اسی محنت کا نتیجہ تھا کہ اس نے جب انٹر کا امتحان دیا تو وہ یونی ورسٹی میں تیسرے نمبر پر آئی اور اسے یونیورسٹی کا سکالرشپ مل گیا ۔ اس کامیابی سے مرلی دھر کو اتنی خوشی ہوئی جیسے یہ وظیفہ اسے ہی ملا ہو ۔

لیکن خوشی کی جو کلی مرلی دھر کے دل میں پھوٹی تھی ۔ کھل نہ سکی ۔ ایک دن وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا جب اسے معلوم ہوا سادھنا کی سگائی پروفیسر شرما سے ہو گئی ہے ، جو نہ صرف ایک بڑے باپ کے بیٹے تھے بلکہ اپنے رسوخ سے جنھوں نے سادھنا کے بھائی کو کسی دفتر میں نوکر کروا دیا تھا ۔ دولت اور رتبہ کی شطرنج پر مرلی دھر کی محبت کا مہرہ دوسری بار پٹ گیا تھا ۔

اس صدمے نے مرلی دھر کی زندگی میں ایک طوفانی ردِ عمل پیدا کر دیا ۔ محبت اور پیار جسے وہ زندگی کا حُسن سمجھتا تھا اب اسے فریب اور سراب نظر آنے لگے ۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ اس تجارتی دور میں اخلاص اور ایثار کی کوئی قیمت نہیں ۔ لوگ نفع کے سودے کرتے ہیں ، گھاٹے کے سودوں کو ٹھکرا کر چل دیتے ہیں ۔ پھر وہ اپنے آدرش کی خاطر اپنی آرزو اور آبرو کو سرِ بازار رسوا کیوں کرائے ؟

کیوں نہ وہ بھی دنیا کی منڈی میں جا کھڑا ہو اور اپنا مول مانگے؟ کیوں وہ محبت اور آدرش پرستی کے چکر میں پڑ کر اپنے کو بے مول بنا کر ذلیل و خوار کرے۔ وہ اب محبت نہیں کرے گا۔ وہ اب تجارت کرے گا۔ خالص تجارت، جس میں اس کی قیمت ہوگی بہت سی نقدی، بہت سا فرنیچر، بہت سے آرائش اور زیبائش کے سامان! اور یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے وہ بھی دھوکے کا وہ کھیل کھیلے گا جو رما اور سادھنا نے کھیلا ہے۔

اور پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے سب رشتہ داروں میں کہہ دیا کہ وہ اس شخص کی لڑکی کا رشتہ مان لے گا جو اسے شادی میں سب سے زیادہ جہیز دے گا۔ اس بات کے نشر ہونے نے ایک بار پھر ان لوگوں کو اس کے گرد جمع کر دیا جو اپنی بیٹی اسے دینا چاہتے۔ لیکن بات وہیں رہی۔ پہلے اس نے ان لوگوں کو اس لیے موہنہ نہ لگایا کہ ان کی لڑکیاں اسے پسند نہ تھیں۔ اس بار اس نے اس لیے انکار کر دیا کیوں کہ ان کا جہیز کافی نہ تھا۔ مرلی دھر اب موٹر سائیکل۔ نقدی اور زیور سب کچھ مانگتا تھا۔

لیکن آخر کار ایک وکیل صاحب مل گئے، جو پہلے بھی ایک بار اس سے مل چکے تھے، جن کی لڑکی تو بہت خوب صورت نہ تھی لیکن انھوں نے اس کے سب سوالوں کے جواب تسلّی بخش طور پر دیے تھے۔

"آپ کیا دیں گے؟"

"پانچ ہزار نقد دے سکتا ہوں۔"

"موٹر سائیکل بھی ....."

"کیوں نہیں!"

"صوفہ سیٹ، ریڈیو سیٹ، قالین ....."

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی باتیں ہیں؟"

"زیور؟"

"کیا اپنی لڑکی کو ننگا ہی ڈولی میں بٹھا دوں گا۔"

"اور پچھلی بار جو آپ نے کہا تھا کہ آپ کے دو مکان ہیں؟" مرلی دھر نے یاد دہانی کرائی۔

"ہاں، ہاں" وکیل صاحب نے مسکرا کر کہا "مجھے دو مکان کیا کرنے ہیں، ایک آپ لے سکتے ہیں۔"

اور اس طرح وکیل صاحب مسمریزم کے اثر میں آئے ہوئے معمول کی طرح مرلی دھر کی ہر مانگ پر "ہاں، ہاں کرتے رہے، اور سگائی پندرہ دن بعد کے لیے طے ہو گئی۔

منگنی کے دن مرلی دھر نے شہر کے تمام بڑے بڑے لوگوں کو مدعو کیا۔ ان میں رما کے والد بھی تھے اور سادھنا کا شوہر بھی۔ ان میں کالج کی منیجنگ کمیٹی کے ممبران بھی تھے، اور کالج کے مشہور طلباء بھی۔

مہمانوں کے خیر مقدم کے لیے اس نے ایک بڑا پنڈال نصب کروایا۔ اتنے ہی بڑے ایک اور پنڈال میں چائے پانی کا انتظام تھا۔ کھانے پینے کے انتظام کے سلسلے میں اس نے شہر کے ایک مشہور ہوٹل کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔

تین بجتے ہی اس کے رشتہ دار آگئے، پھر خاص دوست آئے اور پونے چار بجے کے قریب شہر کے بڑے بڑے لوگ بھی اپنی کاروں میں آپہنچے۔ ان میں رما کے والد اور سادھنا کے شوہر بھی شامل تھے۔ اور تو اور سادھنا اور رما بھی آئی تھیں۔ انھیں دیکھ کر مرلی دھر کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ آگئی "آج وہ ان کے مونہہ پر طمانچہ مار کر اپنی ذلت کا انتقام لے گا۔"

چار بج گئے، چار کے بعد سوا چار بجے، پھر ساڑھے چار، پھر پانچ بج گئے، لیکن وکیل صاحب سگائی لے کر نہ آئے۔ نہ منگنی کی تقریب پر دیے جانے والے پھلوں کے ٹوکرے، نہ مٹھائی کے تھال، نہ نقدی، نہ کپڑے۔ ان کی آمد کا انتظار کرتی ہوئی نظریں تھک گئی تھیں۔ اور پھر لوگ جس ترتیب سے آئے تھے۔ اس کے برعکس لوٹنے لگے۔ پہلے وہ اُٹھے جو بڑے لوگ تھے اور دیر سے آئے تھے، پھر وہ گئے جن سے معمولی تعلق تھا۔ اور چھ بجنے پر سب نے جانے کی اجازت مانگی۔

رمبا اور سادھنا بھی لوٹ گئیں، اس مسکراہٹ کے ساتھ جو پہلے انھیں دیکھ کر مرلی دھر کے ہونٹوں پر پیدا ہوئی تھی۔

دوسرے پنڈال میں لگی ہوئی میزیں جوں کی توں پڑی تھیں۔ چائے کے لیے رکھا ہوا پانی مرلی دھر کے دل و دماغ میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے غم و غصّہ کی طرح کھول رہا تھا۔ ریسٹوران کے بہرے ان قلیوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے جو کسی مسافر کا سامان اُتارنے کے لیے جھپٹے ہیں، لیکن اس کو ٹُٹ پُٹ دیکھ کر اپنی خفّت مٹانے کے لیے دوسری طرف موہنہ کر کے ایسے کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے وہ یوں ہی آئے تھے، یوں ہی کھڑے ہیں۔

مرلی دھر کی آرزوؤں کی گاڑی تیسری بار چھوٹ گئی تھی۔ اور اس بار تو ایسی چھوٹی تھی کہ اس کے پاس آدرش اور اصول کا آسرا بھی نہ رہا تھا۔

پرشوتم پچھلے چار ہفتوں سے عیش کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کے دن آزاد تھے اور اس کی راتیں بھی آزاد۔ برسوں کی ڈھکی چھپی خواہشوں کو اس نے عملی جامہ پہنایا تھا۔ کناٹ پلیس کے ان گنت چکر لگائے۔ دن میں تین تین پکچریں دیکھیں۔ باری باری سب بڑے بڑے ہوٹلوں میں ناچ اور رنگ کی محفلوں سے لطف اندوز ہوا۔ اوکھلے اور قطب مینار کے رومانی مناظر سے اپنے دل اور اپنی آنکھوں کی پیاس بجھائی لیکن جلد ہی اس کی طبیعت ان چیزوں سے متنفر ہو گئی۔

پھر وہ اپنی پرانی زندگی چاہتا تھا۔ اعتدال کی زندگی۔ گھریلو زندگی۔ جس میں اس کے بچوں کی کلکاریاں بھی ہوں اور بیوی کے چہچہے بھی۔ آج اسے دفتر سے چھٹی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ کہیں نہ جانا چاہتا تھا۔ اس کے دفتر کے دو چار ساتھیوں نے پکچر کا پروگرام بنایا تھا، لیکن وہ وہاں بھی نہ گیا۔ یوں ہی چارپائی پر لیٹا لیٹا کروٹیں بدلتا رہا۔ ان کروٹوں سے اس کا جسم دکھنے لگا۔ ہلکے ہلکے درد اور تکان کی اس حالت میں اس نے ایک جھنجھلاتی ہوئی نگاہ کمرے کے چاروں کونوں میں ڈالی۔ اس کی بیوی کی عدم موجودگی میں اور اس کی لاپرواہی کی وجہ سے کمرے کی حالت کتنی بری ہو گئی تھی، اس کا اندازہ اسے آج ہوا تھا۔ کمرے سے بو آ رہی تھی۔ کیلے اور سنگتروں کی

سڑاندسے کمرے کی فضا میں ایک عجیب سی گھٹن تھی۔ ڈھول سے اٹا ہوا سامان، چھت
اور کمرے کے کونوں میں لٹکتے ہوئے جالے، دروازوں اور کھڑکیوں پر لٹکتے ہوئے
میلے پردے گندا میز پوش اور کارنس پر پڑی ہوئی بے ترتیب چیزیں اس بات کی گواہی
دے رہے تھے کہ کسی نے ان چیزوں کی جانب کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ کمرہ اس
ریل کے "ڈبے" کا منظر پیش کر رہا تھا جس میں بے پناہ سامان لدا ہوا ہو۔

اس کے ذہن میں عجیب طرح کا خلفشار تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا کہ
وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ دماغ کی اس حالت میں بھی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آج
کمرے کو دھو کر صاف کرے گا۔ سب چیزوں کو قرینے سے رکھے گا۔ اس خیال کی
تکمیل کے لیے اس نے سب سے پہلے اپنے کمرے میں جھاڑو دی۔ جھاڑو دیتے
دیتے وہ کئی بار رکا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی کمر دکھ رہی ہو۔ پھر بھی ارادے کی
شدت کے زیر اثر وہ اپنے کام میں جٹا رہا۔ اس نے بکھری ہوئی چیزوں کو سنوارا
گندے پردے تبدیل کیے، میز پوش بدلا کارنس پر پڑی ہوئی چیزوں کو صاف
کرکے اپنے اپنے ٹھکانوں پر دھرا۔ کارنس پر پڑی ہوئی سدرشن کی تصویر کو اس نے
چھ بار صاف کیا۔ پہلے یوں ہی میلے کپڑے سے، پھر موہنہ کی بھاپ اور بالآخر پانی سے
اسے محسوس ہوا جیسے اس کی بیوی کی تصویر اس سے شکوہ کر رہی ہے اس کی بے رخی کا
غیر ارادی طور پر اس کی نظریں جھک گئیں۔ وہ شرم کا مارا اپنی بیوی کی تصویر سے بھی
آنکھیں نہ ملا سکتا تھا جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہو، جو ناقابلِ تلافی ہو۔

دھیرے دھیرے اس کے دماغ میں وہ منظر ابھرنے لگا جس کا پردہ گرنے پر
اس کی بیوی میکے چلی گئی تھی اور وہ تن تنہا رہ گیا تھا۔ اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے
اس آزاد ہوا کے لیے جس کی تمنا اس کے سینے میں کئی بار سر ابھاری تھی۔ سدرشن
پہلے بھی کئی بار میکے گئی تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی بار وہ اکیلا رہ چکا تھا۔ لیکن اب

کی بار سدرشن جن حالات میں پسکے گئی تھی وہ کچھ مختلف تھے۔ میاں بیوی میں کہاں جھگڑا نہیں ہوتا۔ کہاں دو برتن نہیں ٹکراتے، لیکن نوبت معین عرصے کے لیے جدا ہونے تک تو نہیں پہنچی۔ وہ اپنی بیوی کی عادات سے اچھی طرح واقف تھا، اور اس کی بیوی اس کی عادتوں سے۔ لیکن اس کی ذرا سی بات ہی کچھ عجیب شکل اختیار کر گئی۔ جیسے دونوں ہی ایک دوسرے سے جدا ہونے کے متلاشی ہوں، یا اپنی اپنی طاقت کا جائزہ لینے کے متمنی ہوں۔ ذرا سی سوجھ بوجھ سے ذرا سی حکمت سے یہ ہنگامہ دور ہو سکتا تھا۔ لیکن نہ جانے ان کے من میں سنک تھی۔ پرشوتم کسی میٹنگ میں شامل ہونے کے لیے گھر سے جوں ہی باہر نکلا تو سدرشن نے اسے چینی لانے کے لیے خالی ڈبا تھما دیا۔ پرشوتم نے اسے کافی سمجھایا کہ وہ واپسی پر ضرور بالضرور چینی لیتا آئے گا، لیکن سدرشن بضد تھی کہ چینی ابھی لائی جائے گی، اُس نے غصّہ سے ڈبا پھینک دیا اور وہ میٹنگ میں شامل ہونے کے لیے گھر سے چل دیا۔ میٹنگ میں بھی اسے کوئی دلچسپی نہ محسوس ہوئی۔ وہ ایک بت کی طرح وہاں بیٹھا رہا اور غیر ارادی طور پر وہاں سے جلدی ہی چلا آیا۔ گھر لوٹ کر اس نے سدرشن سے کوئی بات نہ کی تھی، اور خود پلنگ پر پڑ رہا تھا جب اسے سدرشن نے کھانا کھانے کے لیے کہا تھا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ اگر وہ کھانا کھا لیتا تو بھی بات یہاں تک نہ پہنچتی۔ اس کے بعد سدرشن نے بھی کھانا نہ کھایا۔ رات کی تاریک خاموشی کو جب سدرشن کی سسکیوں نے توڑا تب بھی ان سے بے نیاز ہو کر پرشوتم کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے بالکل خیال نہ آیا کہ وہ سدرشن کو منا لے جیسے کہ وہ بھول گیا ہو کہ سدرشن اس کی بیوی ہے۔ اس کے پہلو میں بھی دل ہے۔ وہ پتھر کی مورتی نہیں۔ اس دن اسے اس بات کا غصّہ تھا کہ سدرشن نے کیوں اُسے میٹنگ پر جانے سے روکا۔ پہلے بھی اس نے ایک دو بار ایسا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پرشوتم کی ہنسی نے بات نہ بڑھنے دی تھی۔ آج

اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ چھٹی کے دن سدرشن چاہتی ہے کہ وہ اس کے پاس بیٹھے، محبّت بھری باتیں کرے۔ اِدھر اُدھر کے قصّے سنائے اور گلی محلّے کی باتیں سنے۔ اتوار ہی کو تو انھیں مل بیٹھنے کی فرصت ہوتی ہے اور ان ہی لمحات میں وہ گھر سے غائب ہونا چاہتا ہے۔ نہیں نہیں وہ اپنے پاؤں میں زنجیریں نہیں ڈال سکتا۔ وہ سدرشن کا پتی ہے نوکر نہیں۔ اگر سدرشن اس کے بغیر میکے رہ سکتی ہے تو وہ یہاں تنِ تنہا رہ سکتا ہے۔ تو ———— وہ اسے نہیں لائے گا نہیں لائے گا وہ خود آجائے گی اور دس دن تک۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ ننھا راجیش اور رومی اپنے باپ کے بغیر کیسے رہتے ہوں گے۔ وہ تو بے قصور ہیں۔ روتے ہوں گے وہ بےچارے انھیں کون چپ کراتا ہوگا۔ بلکتے، بسورتے سو جاتی ہوں گی معصوم جانیں۔ یا پھر دفورِ محبّت سے لاڈ اور پیار سے ننھے بگڑ رہے ہوں گے۔ ضد کرتے ہوں گے تو اُن کی ضد پوری ہوتی ہوگی۔ روتے ہوں گے تو کوئی انھیں چپ کراتا ہوگا۔ بات بغیر بات کے ان کی خواہشات کو پورا کیا جاتا ہوگا۔

اس کے دماغ میں طرح طرح کی باتوں کے بگولے اٹھتے اور مٹ جاتے وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا، وہ کیا کرے۔ ایک بار پھر اس نے سدرشن کو بھلانے کی کوشش کی۔ اس ادھیڑ بُن میں وہ نہایا اور نئے کپڑے پہن کر بازار کی جانب چل دیا۔ حالانکہ پچھلے چار ہفتوں سے ہی اس کی طبیعت کچھ کچھ خراب تھی۔ بازار کا کھانا اسے ہضم نہ ہوتا تھا، اس لیے کھٹی کھٹی ڈکاریں آتی تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ کھانا کھانے کے لیے ہوٹل میں گھس گیا۔ اپنی مرضی کے خلاف اس نے دو چار پھلکے زہر مار کیے اور وہاں سے اجمل خاں روڈ پر پہنچ گیا۔ کتنی حسین سڑک تھی اور کتنے حسین چہروں کا اجتماع۔ نئے نئے لباسوں میں دیدہ زیب چہرے، بھرے بھرے جسم، نئے نئے فیشنوں کے اظہار کے لیے، نمائش کے لیے، جلوہ نمائی کی خاطر، اِدھر اُدھر گھوم رہے

تھے۔ دوکانوں پر کتنی بھیڑ تھی، جیسے آج ہی لوگوں کو سب کچھ خرید لینا ہو۔ لیکن اسے اس ہنگامہ سے، اس دوڑ دھوپ سے، اس جلوہ نمائی سے کوئی غرض نہ تھی۔ اسے یہ سب کچھ پھیکا پھیکا سا اور بے مزہ سا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے گھومتے پھرتے چہرے قبرستان سے ابھرتی ہوئی لاشیں محسوس ہوئیں۔ کوئی چہرہ اسے اپنی جانب نہ کھینچ سکا، اور وہ مضمحل سا، اداس سا، بجھا بجھا سا ہی گھر لوٹ آیا۔

کمرہ گو بالکل صاف تھا، لیکن اس میں وہی گھٹن تھی، وہی اضطراب تھا۔ وقت گزارنے کے لیے اس نے اخبار اٹھایا۔ لیکن سرخیاں دیکھنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ ساری دنیا میں ہی کوئی ہنگامہ نہیں۔

اخبار پڑھنے کے بعد وہ یوں ہی کرسی پر بیٹھا رہا۔ اس کا دماغ بالکل خالی تھا۔ وہ خود بھی کوئی چیز سوچنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے ایک ناول اٹھایا اور بڑی تیزی سے اسے پڑھنے لگا۔ اسے ناول کی کہانی بالکل اچھی نہ لگی۔ اسے ان مشہور نقادوں کے ذوق سلیم پر غصہ آیا جنھوں نے اس ناول کے بارے میں اتنے اچھے ریویو لکھ ڈالے تھے۔ چھپے ہوئے حروف اسے یوں محسوس ہوئے جیسے کسی نے سفید چادر پر سیاہی انڈیل دی ہو۔ ناول کو وہیں چھوڑ کر وہ دوبارہ گھر سے نکلا۔ طبیعت کی گرانی کو دور کرنے کے لیے اس نے چاہا کہ وہ کسی دوست کے ہاں جائے، اسی ارادے کے تحت وہ ستیش کے ہاں پہنچا۔ ستیش گھر پر نہ تھا۔ مایوسی کے عالم میں اس کے قدم پورن کے گھر کی جانب بڑھ گئے۔ پورن نمائش دیکھنے کے لیے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گھر سے نکل رہا تھا۔ پورن اور اس کے بیوی بچوں کے چہروں پر کھلی ہوئی ہنسی اور معصومیت نے پرشوتم کو ایک بار پھر اپنی بیوی کی یاد دلائی۔ وہ کھویا کھویا، اداس اداس، بجھا بجھا غیر ارادی طور پر گھر کی جانب لوٹنے لگا۔ اسی حالت میں وہ پھر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اسے کسی کروٹ بھی چین

نہیں تھا۔ چارپائی پر بیٹے لیٹے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی پرانا مریض ہو۔ اس کے دل میں خلش ہو رہی تھی جو کئی بار اتنی تیز ہو جاتی تھی کہ وہ اسے برداشت کرنے کے قابل نہ رہتا۔ اس کے دل کے نہاں خانے میں سدرشن کی یاد پھر ابھر رہی تھی۔ اس کے ننھے روحی دا جیش اسے پاپا پاپا کہہ رہے تھے، لیکن جوں ہی اس کی آنکھیں ادھر اُدھر کمرے میں کسی کو تلاش کرتیں تو وہاں ہوا کی سرسر کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ زندگی میں اس طرح کی کیفیت اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ پہلے بھی سدرشن کئی بار میکے گئی تھی، لیکن وہ اس کی جدائی ایک دن بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اسے گاڑی پر چڑھانے کے بعد گھر لوٹتے ہی اسے وہ ایک لمبا خط لکھتا وہ بےچاری اس کا خط پڑھ کر گھبرا جاتی، مہینوں کا وعدہ کرکے جاتی، دنوں میں لوٹ آتی۔ لیکن یہ تو ان دنوں کی بات ہے جب اس کی شادی نئی نئی ہوئی تھی۔

لیکن اب کیا ہو گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ محبت مر تو نہیں جاتی۔ دنیا میں اتنے جوڑے ہیں کیا ان کی محبت یوں مر جاتی ہے؟ نہیں۔ پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہو کیوں نہ وہ دہی شمع زندگی پھر جلا دے میں رومان چاہیے، چین چاہیے خوشی چاہیے۔ یہ سب چیزیں بیوی سے مل سکتی ہیں۔ بہت رومانی صورت میں نہ سہی لیکن بہت ٹھوس، بہت مستقل، بہت گہری اور پائیدار صورت میں۔ پھر اس نے اپنے گلشن سے خوشی کو کیوں بدر کیا۔ لمحاتی عیش کے لیے جو سراب کے سوا کچھ نہ تھے۔ اسے احساس ہونے لگا کہ اس نے اس دن وقت کی نزاکت کو عقل مندی سے نہیں جذباتی انداز سے سلجھانے کے بجائے الجھا دیا تھا۔ لیکن وہ اب بھی ان الجھنوں کو سلجھا سکتا ہے۔ اسے انھیں سلجھانا چاہیے۔

اور جیسے کدورت کے پشتے ڈھے گئے اور محبت کے سوتے آزاد ہو کر ایک بار پھر بہہ نکلے۔ قلم کاغذ لے کر وہ اپنی بیوی کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اسے سوچنے

کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ قلم خود بخود چلنے لگا اور الفاظ ستار کے تار سے نکلے سروں کی طرح خود بخود کاغذ پر پھیلنے لگے۔ وہ لکھتا رہا، لکھتا رہا۔ اس کی تحریر میں ترسی ہوئی محبت کا والہانہ وفور دہکتا گیا۔ فقرے پہاڑی چشمے کی زمزمہ خیز روانی کے ساتھ خط کی وادی میں بہتے چلے گئے اور جب اس کا قلم رکا تو اسے محسوس ہوا وہ خط کاغذ کا ایک ٹکڑا نہیں ہے۔ وہ اس کے جذبات کے پانیوں سے لبالب جھیل ہے، آرزوؤں اور امنگوں کی خوشبوؤں سے مہکتا گلستاں ہے اور اس کے ان خوابوں کا آئینہ خانہ ہے جو اس کے ماضی سے لے کر اس کے مستقبل تک قطار بناتے چلے گئے ہیں۔

اور اس جوش اور جذباتی وفور کے عالم میں وہ خط کو ڈاک میں ڈالنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میز کی دراز کھولی، ایک لفافہ پڑا تھا۔ اس نے لفافہ نکالا۔ خط ڈال کر بند کیا اور کوٹ پہن کر خط ڈالنے کے لیے کمرے سے باہر جانے لگا۔ لیکن عین اس وقت اس کی نظر آئینہ پر پڑ گئی۔ آئینہ میں اس کا اپنا عکس تھا۔ لیکن عکس کو دیکھ کر وہ ٹھٹک سا گیا۔ عکس جیسے کچھ کہہ رہا تھا "تو تم جھک گئے۔ تم نے مجھے بھی ہرا دیا؟ غلطی تمہاری بیوی کی بھی تھی۔ لیکن اس نے تو خط نہ لکھا۔ اس کی محبت نے تو اسے پندار کی دیوار پھلانگ کر آنے کے لیے مجبور نہ کیا۔ پھر تمہیں کیا ہوا تم کیوں جھکے ——— ؟ ٹھیک ہے تم اُداس ہو، اکیلے ہو۔ تمہارے دن بے کار اور راتیں بے معنی ہیں۔ لیکن تم اس کے آستانہ پر کیوں جھکو جسے تمہاری ضرورت نہیں جس کے دن جس کی راتیں تمہارے بنا سونے نہیں ہیں۔ اگر سدرشن نہیں آئی اس نے تمہیں خط نہیں لکھا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے دل نے اسے مجبور نہیں کیا۔ تم اس کے لیے وہ نہیں ہو جو سدرشن تمہارے لیے ہے پھر کیا اپنی محبت کی سوغات اور خودداری کے تحائف اس پر لٹاؤ گے جسے ان کی ضرورت نہیں ؟"

"نہیں ہرگز نہیں" اور جیسے پرشوتم کا سویا ہوا جذبۂ خودداری اور جاگ اٹھا "نہیں میں اُسے خط نہیں لکھوں گا۔ میں مرد ہو کر عورت سے ہار تسلیم نہیں کروں گا۔ میں یہ خط ڈاک میں نہیں ڈالوں گا" اور اس نے جوتے اُتار دیے، کوٹ اتار دیا اور اپنے لیے چائے کا ایک کپ بنانے کے لیے رسوئی کی طرف جانے لگا۔ لیکن عین اس وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ "کون" اس نے مڑ کر پوچھا۔ جواب میں ایک بار دستک اور ہوئی۔ پرشوتم کے ماتھے پر شکن سی پڑ گئی۔ جھنجھلاہٹ کے عالم میں اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

"کون؟ تم؟ سدرشن" پرشوتم کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

"ہاں" سدرشن نے صرف اتنا کہا۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اُس کی آواز گری ہوئی تھی۔ وہ شکست کی مورتی بنی کھڑی تھی۔

"تم آگئیں" پرشوتم نے یکایک مسرّت سے لبریز لہجہ میں کہا۔

"ہاں، میں بن بلائے آگئی، اب خوش ہو تم؟" سدرشن کے چہرے پر شکست کے سوز کی پرچھائیں اور گہری ہو گئی۔ اس کی آواز تقریباً بھرا گئی۔ اس کی آنکھوں میں ہار کی علامت کے آنسو جھلملانے لگے۔

اور پرشوتم کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی انا کے موہنہ پر طمانچہ مار دیا ہو، اس کی بدگمانی کے مکروہ چہرے کو آئینہ دکھا دیا ہو۔ اس کی محبت کو اپنی بلند بے پایاں محبت کے مقابلہ میں رکھ کر حقیر اور بے معنی ثابت کر دیا ہو۔ وہ ندامت کے پانیوں میں بھیگ گیا اس نے آگے بڑھ کر سدرشن کو اپنی باہوں میں لے لیا اور اس کے بالوں میں موہنہ چھپا کر بولا "سدرشن تم بنا بلائے نہیں آئی ہو۔ تم کو میں نے بلایا ہے۔ میں نے ..... اس خط کے ذریعے جواب بھی میری جیب میں محفوظ ہے جسے میں ابھی ڈاک میں ڈالنے جا رہا تھا۔ تمھارا آنا تمھاری ہار ہے تو میرا خط لکھنا بھی میری ہار سے کم نہیں ہے کیوں کہ میں نے بھی محسوس کر لیا.... میں تمھارے بنا رہ نہیں سکتا، نہیں رہ سکتا"

••

بدری ناتھ ساری کانچ کی گولیاں ہار چکا تھا۔ اس کھیل میں اس کی وہ گولیاں بھی نہ رہی تھیں جو اس نے پچھلے کئی برسوں سے سنبھال کر رکھی تھیں۔ اس کی طبیعت تلملا رہی تھی کہ کہیں سے اسے ایک روپیہ مل جائے اور وہ اتنی گولیاں خرید لائے کہ اس کا خزانہ کبھی ختم نہ ہو۔ ایک روپے کی تلاش میں وہ کہاں نہ گیا تھا؟ اسے کسی نے بتایا تھا کہ بازار میں کئی بار گاہکوں کے پیسے گر جاتے ہیں وہ بازاروں کے دسیوں چکر لگا چکا تھا۔ ان چکروں کے بعد وہ اسٹیشن اور سینما بھی ہو آیا تھا۔ لیکن اسے کہیں کانی کوڑی بھی نہ ملی تھی۔ آخر تھک ہار کر اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس سلسلہ میں گھر ہی میں کوشش کرے گا۔ ایک دوپہر کو وہ اپنی دادی کے کمرے میں چپکے سے داخل ہوا۔ کڑکڑاتی ہوئی دوپہر میں سب سو رہے تھے۔ دھیمے دھیمے قدموں سے وہ بڑی چارپائی پر چڑھا تھا۔ اس نے چابی اتار کر اپنی دادی کا ٹرنک کھولا۔ اس میں چاندی کے بے شمار روپے تھے۔ نئی نئی چونیاں تھیں۔ اٹھنیاں تھیں۔ ان میں سے اس نے صرف ایک روپیہ نکالا تھا۔ لیکن معمولی سی آہٹ سے گھبرا کر اس نے وہ پھر وہیں رکھ دیا جب پلٹ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ صرف اس کے اپنے دل کی دھڑکن تھی جو کمرے کی خاموش فضا میں گونج رہی تھی۔ دل کڑا کر کے اس نے ایک

بار پھر ٹرنک میں ہاتھ ڈالا۔ اس بار ایک روپے کی بجائے دو روپے اس کے ہاتھ لگے
جوں ہی وہ ٹرنک بند کر کے پلٹا ایک آہنی پنجے نے اس کی گردن دبوچ لی تھی۔ ایک
چیخ کو دباتے ہوئے جب اس نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں تو اس کی حیرانی کی حد نہ رہی
اس کے دادا جان نے اسے پکڑا ہوا تھا۔ ان کی سرخ سرخ آنکھیں اس کے پورے
وجود پر جھلسا دینے والے شعلے برسا رہی تھیں وہ ان آنکھوں کی تپش کی تاب نہ لا سکا
اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو اس آہنی پنجے کے سپرد کر دیا۔

اُس دن کے بعد سے ایسی حرکت کرنے کی اس نے توبہ کر لی تھی۔ اُن آنکھوں کے
خیال ہی سے اس کے تمام وجود میں وہ کپکپی دوڑ جاتی کہ دو سال تک تو وہ چوری کے
تصور کو بھی ذہن میں نہ لا سکا۔ لیکن دو سال بعد پھر نہ جانے کیسے وہ دادا جان کی نگاہوں
کو ایک لمحہ کے لیے بھول گیا اور اس نے دوسری بار چوری کی کوشش کی۔ سردیوں
کے دن تھے آسمان پتنگوں سے اٹا ہوا تھا۔ "وہ کاٹا" "وہ کاٹا" کے شور سے فضائیں
گونج اٹھی تھیں۔ بدری ناتھ کی طبیعت کئی دنوں سے مچل رہی تھی کہ وہ بھی پتنگ اڑائے
اور آسمان پر اُڑنے والی سب پتنگوں کو کاٹ دے۔ اسے گھر سے صرف اکنی ملتی تھی اور
وہ اسکول کے دروازے پر بیٹھے ہوئے چھابڑی والے کے پلے پڑ جاتی تھی۔ زنجیر مار کر
ڈوری ریل کے لیے اس کے پاس پیسے کہاں سے آتے؟ اس لیے ایک بار پھر اس
نے اس سلسلہ میں کوشش کی۔ مگر دن کی بجائے اس نے رات کا پچھلا پہر اس کام
کے لیے منتخب کیا جب سب لوگ گہری نیند میں ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ ساری
رات جاگتا رہا تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز اسے بار بار سنائی دیتی رہی۔ گھر کے
ماحول میں خراٹے ہی خراٹے تھے۔ جب گھڑی نے دو بجائے تو دبے پاؤں وہ پھر اُس
کمرے میں گھسا جس میں دادی جان کا مال پڑا تھا۔ کمرے میں گھستے ہی اس نے اندر
سے کنڈی بھی چڑھا لی تھی، لیکن دل اس کا اب بھی دھک دھک کر رہا تھا وہ

رُک گیا۔ ایک بار پھر اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ لیکن وہاں کون ہو سکتا تھا؟ جب اس نے ٹرنک کا تالا کھولا تو اسے پھر محسوس ہوا کہ کسی فولادی ہاتھ نے اُسے گردن سے پکڑ لیا ہے۔ اس کے ہاتھ اپنی گردن کی طرف اٹھ گئے، لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔ جی کڑا کرکے اس نے دادی کی صندوقچی سے پانچ روپے کا نوٹ نکال لیا۔ لیکن جوں ہی وہ کنڈی کھول کر باہر نکلا۔ اس کے دادا جان پھر اپنی شعلے برساتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہاں کھڑے تھے۔ چوری پھر پکڑی گئی اور اس جرم کی وجہ سے اس کی مرمت بھی ہوئی، مار پیٹ تو خیر عارضی تھی۔ چند لمحوں کے لیے اس کا جسم دُکھا پھر ٹھیک ہو گیا لیکن وہ دادا جان کی آنکھوں سے نجات نہ پا سکا۔ جب بھی وہ کوئی غلط کام کرتا، چوری چھپے حرکت کرتا، اس کے دادا جان کی وہ شعلہ بار آنکھیں آجاتیں۔ اس کی روح کانپ اٹھتی، عزم میں لغزش پیدا ہو جاتی اور وہ اپنا ارادہ چھوڑ بیٹھتا دادا جان کی آنکھیں خوف، راست بازی اور تاکید کا آتشیں نشان بن کر اس کے تصور پر چھا گئی تھیں۔

جب وہ بڑا ہوا تو بھی یہی حالت رہی۔ جب بھی اس کی طبیعت کسی غیر سماجی فعل کی جانب مائل ہوتی، وہ آنکھیں اس کے سامنے آجاتیں وہ کانپ جاتا۔ اُس کے بازوؤں میں کپکپاہٹ پیدا ہو جاتی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگتیں۔ ایک دو بار جب اس نے بھول کر کسی کی چیز اٹھائی تو بھی اُسے محسوس ہوا ایک فولادی پنجے نے اس کی گردن کو گرفت میں لے لیا ہے اور وہ آنکھیں اس پر آگ برسانے لگی ہیں۔

کالج جانے پر وہ یکایک دادا جان کی آنکھوں کے عذاب سے نجات پانے میں کامیاب ہو گیا۔ کالج میں اپنے اردگرد گھومتے لڑکوں کو جب وہ نئے نئے بوٹوں، سوٹوں اور ٹائیوں میں دیکھتا تو اس کی روح پھڑک اٹھتی۔ کاش اس کے پاس بھی نئی نئی ٹائیاں ہوتیں، اسنے سوٹ ہوتے، نئے بوٹ ہوتے، وہ بھی شہزادوں کی طرح کافی ہاؤس میں بیٹھ کر موج اڑا سکتا۔ لیکن ان چیزوں کے لیے پیسہ کہاں سے آتا۔ اسے تو مشکل سے

پانچ روپے ماہوار جیب خرچ ملتا تھا۔ جو زیادہ سے زیادہ دس دن چل پاتا۔ ایک دو بار اس نے نئی کتابیں خریدنے کے بہانے کچھ پیسے گھر والوں سے اینٹھے بھی، لیکن یہ بہانے کب تک اس کی مدد کر سکتے تھے۔ اس کے بعد اس نے سادہ لوح دوستوں سے اُدھار لیا، لیکن اُدھار تو لوٹانا پڑتا تھا۔ اور اس نے آج تک اُدھار نہ لوٹایا تھا اس کی طبیعت جھوٹ اور دھوکے کی تاریک گلیوں میں بھٹکنے کے لیے بے چین ہونے لگی۔ اب دادا جان کا خوف بھی نہ تھا۔ وہ تو پرلوک سدھار چکے تھے۔ مُردے کی آنکھوں سے ڈرنا پرلے درجے کی کمزوری تھی۔ اس لیے اس خوف، ڈر اور وہم سے دامن چھڑا کر بدری ناتھ نے ہزار بہانوں سے دوستوں کی جیبیں صاف کرنی شروع کر دی تھیں۔ اور مالِ غنیمت سے اس کے سوٹ سلنے لگے، بوٹ آنے لگے، اور وہ لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ کر کافی ہاؤس کے بِل ادا کرنے لگا۔ اب دادا جان کی نگاہیں اسے نہ ستاتیں۔ لیکن کبھی کبھی رات کی تاریکی میں، خواب میں تنہائی میں اس کے کانوں میں کسی کی آواز آتی جیسے اسے کوئی پیار سے بلاتا

"بیٹا!"

"جی"

"میری سنو گے؟"

"جی!"

"اِس ارادہ کو چھوڑ دو جس پر تم چل رہے ہو۔ یہ چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں، ریت ہے، سراب ہے!"

اور یہ سُن کر بدری ناتھ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوتا۔ بجلی جلا کر دیکھتا تو اسے کمرے میں اپنے سوا کوئی دوسرا دکھائی نہ دیتا۔ سُنی ہوئی باتوں کا رات بھر اثر رہتا لیکن صبح کی روشنی میں پھر وہ سب کچھ بھول جاتا۔

اور پھر کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بدری ناتھ نے آگرہ میں نوکری کر لی تھی عہدہ اسٹورکیپر کا تھا۔ لاکھوں روپے کا مال اس کی تحویل میں تھا۔ چند مہینوں کی نوکری کے بعد اتنا مال اپنے قبضے میں دیکھ کر اس کا من للچانے لگا تھا۔ کاش وہ اس سامان کو یہاں سے اٹھا کر لے جا سکے۔ اس کی اپنی تنخواہ میں تو دال روٹی بھی مشکل سے چلتی تھی۔ عیش کرنے کی اس میں گنجائش ہی کہاں تھی۔ اور وہ تو عیش کرنے کے ہی نہیں، لکھ پتی بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ دن رات وہ اسی دھن میں کھویا کھویا دکھائی دیتا اور سوچا رہتا کہ کیسے وہ اس سامان کا کچھ حصہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لے اُڑے سامان اڑانا تو ناممکن سی بات تھی۔ ہر چیز کا حساب تھا اور یہ حساب نہ صرف ایک جگہ بلکہ کئی جگہوں پر درج تھا۔ وہ ابھی سامان اڑانے اور باہر نکالنے کے طریقے سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی تبدیلی کوئٹہ ہو گئی۔ کوئٹہ جانے سے پہلے اس کے والدین نے اس کی شادی بھی کر دی تاکہ اسے پردیس میں کھانا پکانے کی دقت نہ ہو کوئٹہ آئے انھیں ابھی چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ وہاں زبردست بھونچال آ گیا۔ زلزلے نے سارا شہر تباہ کر دیا۔ خود بدری ناتھ کی بیوی مکان کی دیوار کے نیچے دب کر مر گئی تھی۔ لیکن اس بات کا بدری ناتھ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا اس نے تو اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر بے تحاشہ دولت اکٹھا کی تھی۔ سامان لوٹتے لوٹتے اسے ایک دو بار احساس بھی ہوا تھا کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ لیکن اسے گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بے خطر گرے ہوئے مکانوں سے مال نکال لایا تھا۔ مرتے ہوئے، چیختے ہوئے انسانوں کے موہنہ میں اس نے پانی نہ ڈالا تھا بلکہ پتھر دل ہو کر اپنے من کی پیاس بجھائی تھی۔ اردگرد پھیلے ہوئے ملبے اور لاشوں کے درمیان سونے چاندی کے ڈھیروں کا خاصا حصہ اب بدری ناتھ کے قبضہ میں آ چکا تھا اور دولت اکٹھی کرنے کی حرص آج

بڑی حد تک پوری بھی ہو گئی تھی۔

اور پھر کوئٹہ سے اس نے خود ہی کراچی کی تبدیلی کرائی تھی۔ اب وہ معمولی اسٹور کیپر سے چیف اسٹور کیپر بن گیا تھا۔ اس کے لحیم شحیم خوبصورت جسم اور دل آویز شخصیت سے متاثر ہو کر اسی کے محکمہ کے ایک افسر نے اس کی شادی اپنی اکلوتی لڑکی سے کرنے کی تجویز بھی پیش کی تھی اور بدری ناتھ نے تجویز جھٹ پٹ مان لی تھی، محض اس خیال سے کہ لڑکی کے والدین کی موت کے بعد ان کا اثاثہ بھی اسے مل جائے گا اب بدری ناتھ کے مزے تھے۔ دفتر میں اس کی نگرانی میں قیمتی میڈیکل اسٹور تھا جس میں گھڑیاں بھی تھیں اور تھرما میٹر بھی۔ قیمتی دواؤں کا تو کچھ شمار نہ تھا۔ محض اس کے "ٹوٹ گیا" "خراب ہو گیا" لکھ دینے سے ہزاروں روپے کا سامان رجسٹروں سے خارج ہو سکتا تھا۔ اس سہولت کا فائدہ اٹھا کر بدری ناتھ نے ہزاروں کا سامان خرد برد کرنا شروع کر دیا۔ پہلے پہل تو اس کی بیوی نے بدری ناتھ کی اس حرکت کی بے حد مخالفت کی مگر جب بدری ناتھ نے اسے "مورکھ" اور "بے سمجھ" کے الفاظ سے نوازا اور بے تحاشا ڈانٹ پلائی تو وہ چپ ہو گئی۔ بدری ناتھ چند ہفتوں میں کافی سامان خُرد بُرد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ سامان تو اس نے چور بازار میں بیچا بھی اور باقی سامان اس نے اپنے گھر بھیج دیا تاکہ آہستہ آہستہ بیچ سکے۔ اس کے پاس اب کافی نقدی ہو گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس نے اتنی اچھی نوکری پر لات مار دی۔

نوکری چھوڑ کر وہ اپنے شہر میں آ پہنچا تھا۔ اُن دنوں دوسری جنگِ عظیم جاری تھی اور شہروں میں اناج کا راشن تھا۔ بدری ناتھ نے اناج پیسنے کا کارخانہ کھول لیا یہ کارخانہ رات دن چلنے لگا تھا اور لاکھوں من سرکاری اناج اس میں پس کر مارکیٹ میں جاتا تھا۔ راشن انسپکٹروں کو رشوت دے کر بدری ناتھ نے گندا آٹا

اناج بیچ کر لوگوں کو دیا اور دو برسوں میں ہی اس کے وارے نیارے ہو گئے۔
دولت کچی نسّی کی طرح بڑھ رہی تھی اور دولت کی فراوانی نے بدری ناتھ کو عیاشی کے ان تمام پہلوؤں سے آشنا کرا دیا تھا، جن سے ایک انسان آشنا ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی بیوی کی پرواہ نہ کی، اپنے خاندان کی عزت کی ضرورت نہ سمجھی، وہ دولت اکٹھی کرتا اور اسے رنڈیوں کے کوٹھوں پر لُٹا آتا۔ وہ بے حد بد مزاج ہو گیا تھا۔ وہ نوکروں کو گالیاں دیتا تھا، اور مزدوروں کو محنتانہ نہ دیتا۔ کم پیسے دے کر زیادہ روپوں کی رسیدیں حاصل کرتا۔ ہر وسیلے سے پیسہ ہی پیسہ اکٹھا ہو رہا تھا۔ وہ محض ان لوگوں کی قدر کرتا جن سے اسے آمدنی کی امید ہوتی۔ وہ جھوٹے حساب پیش کر کے انکم ٹیکس کے محکمے کی آنکھوں میں بھی دُھول جھونکتا تھا۔ دھوکا، چار سو بیس، لوٹ کھسوٹ، خرید و فروخت کرنا اس کی زندگی کے شغل تھے۔ اب وہ ضبط اور احتیاط کی حدوں کو پار کر چکا تھا وہ کھانے لگتا تو چار چار مرغے کھا جاتا۔ پینے لگتا تو بوتل سے کم نہ پیتا۔ اس کی زندگی میں اعتدال تو نام کو نہ تھا وہ امیر تھا، بارسوخ تھا۔ اور پھر چلتا پرزہ۔ اس لیے نہ اسے قانون کا ڈر تھا نہ کسی دوسری شخصیت کا۔ اس نے جان لیا تھا کہ پیسے سے ہر مشکل حل ہو سکتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر قانون اور اخلاق کے پہرے دار بھی خریدے جا سکتے ہیں۔ اس لیے قانون اور سماج کے آہنی پنجے اُسے گرفت میں نہ لے سکتے تھے اور وہ اپنی دھن میں مست نہ جانے کدھر چلا جا رہا تھا۔ اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ لیکن شراب غذا اور دواؤں کے بل بوتے پر وہ چلے جا رہا تھا۔

لیکن ایک دن اچانک اس کی صحت نے جواب دے دیا۔ اُسے ایمبولینس میں ڈال ہسپتال لے جانا پڑا۔ اسے اختلاج قلب کا دورہ پڑ گیا تھا۔ جب اسے تین دن کے بعد ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو کارخانے کے بجائے ہسپتال کے کمرے میں

پایا. ڈاکٹروں نے معائنہ کے بعد اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ اسے ذیابیطس کی شکایت ہے، ہائی بلڈ پریشر ہے اور یہ بیماریاں اپنی انتہائی حد تک پہنچ کر لا علاج ہو چکی ہیں۔ اگر وہ زندہ رہنا چاہتا ہے تو اسے اُبلی ہوئی سبزیاں کھانی ہوں گی، شراب نوشی کو ترک کرنا ہوگا، نمک اور چینی چھوڑنی ہوگی۔ زندگی نے اسے سب کچھ دیا تھا لیکن وہ اسے استعمال نہ کر سکتا تھا۔ ذیابیطس نے اس کا جسم کھوکھلا کر دیا تھا۔ بظاہر وہ موٹا تھا لیکن اس میں گھومنے پھرنے کی سکت نہ تھی۔ اس کے موہنہ سے بو آتی اور جسم کے کئی حصّوں میں پھوڑے تھے۔ وہ گدگدے بستروں پر بھی چین سے لیٹ نہیں سکتا تھا۔ جسمانی دکھوں کے علاوہ اب اسے روح کا وہ خلا بھی ستا رہا تھا جو شباب کے نشے اور عیش پرستی کی لذت سے اب تک چھُپا رہا تھا۔ اس کا اپنا کوئی بچہ نہ تھا جو اس کے مال کا وارث بنتا، بڑھاپے میں اس کی لاٹھی ہوتا۔ اس کی حسین بیوی اس کی عطا کردہ کسی گھناؤنی بیماری کا شکار بن چکی تھی اور اولاد پیدا نہ کر سکتی تھی۔ جہاز سے بڑے مکان میں وہ اور اس کی بیوی اکیلے تھے۔ تنہائی میں اس کا کوئی دوست نہ تھا، غم خوار نہ تھا۔ رات کی تاریکی میں، مہیب خاموشی میں جب کبھی وہ آنکھیں بند کر کے دیکھتا تو اب اس کا سیاہ ماضی ابھرنے لگتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ زندگی اسے اس کے سیاہ اعمال کی سزا دے رہی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے ذہن میں دادا جان کی آنکھیں ابھرنے لگتیں جنھوں نے اسے سیدھے رستے پر چلنے کی ہدایت کی تھی۔ مگر اب وہ سنبھلنے کی حد سے گزر چکا تھا۔ مجبور اور بے بس پنچھی کی طرح پنجرے سے سر پٹخنے کے سوا اس کے پاس چارہ بھی کیا تھا؟ اور زندگی کے ہر محاذ پر فتح پانے والا بے دھڑک سپاہی قدرت کے انصاف کے آگے ہار گیا تھا۔ اور دادا جان کی بڑی بڑی آنکھیں اپنے پوتے کی زندگی کے اس المیہ کو غم اور غصّے کے ملے جلے جذبات سے دیکھے جا رہی تھیں۔

ماسٹر چمپا رام کی دونوں لڑکیاں جوان ہو رہی تھیں اور ان لڑکیوں کی جوانی نے ہی اپنے پتا کی پُر سکون زندگی میں ہل چل مچا دی تھی۔ وہ دن بھر سکول میں کام کرتے۔ رات کو ٹیوشنیں پڑھاتے اور اس کے علاوہ ہر وہ کام کرتے جس سے انھیں دو پیسے کی بچت ہوتی تھی اور پچھلے کچھ مہینوں سے تو ان کی یہ بچت کی دھن حد سے زیادہ بڑھ چکی تھی۔ اب تو انھوں نے صرف ایک وقت کھانا شروع کر دیا تھا۔ کوئی زمانہ تھا کہ مہمان کی تواضع کرنا وہ اپنا فریضہ سمجھتے تھے، لیکن اب تو مہمان کے تصور سے ہی ان کے ذہن کا توازن بگڑنے لگتا۔ ان کی شانتی بھنگ ہو جاتی۔ آخر اس میں ان کا قصور ہی کیا تھا۔ انھیں تو اپنی لڑکیوں کے لیے جہیز بنانے کو روپیہ چاہیئے تھا روپیہ۔ اور ان کی قلیل آمدنی سے جہیز بننا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اسی فکر نے ان کی صحت کو گھلا دیا تھا۔ رات کو سوتے سوتے بھی بڑبڑانے لگتے۔ ہائے ان لڑکیوں کے ہاتھ کیسے پیلے ہوں گے؟ وہ کب اس فرض سے سبکدوش ہوں گے اور دن کی روشنی میں یہ خوف اژدہے کی پھنکار کی طرح ان کے کانوں میں گونجنے لگتے۔ اس خیال کے آتے ہی ان کا روم روم اس طرح کانپ اٹھتا جیسے زلزلے سے مکان۔ اس خوف نے ان کے پیسہ کمانے کی دھن کو اور بڑھا دیا

تھا۔ ان کی پگڑی چیتھڑوں سے بدتر تھی۔ گرم کوٹ کی آستینوں میں چمڑہ لگ گیا تھا، استر پھٹ گیا تھا قمیص اور پاجامے کے روشن دانوں کو مجبوری سے سیا ہوا تھا۔ جوتے کے پیوند اس طرح جلوہ افروز تھے جیسے آسمان پر ستارے۔ ماسٹر جی کی بیوی نے ان کی اس حالت کو دیکھ کر کہا کہ "بھگوان سب کچھ ٹھیک کر دے گا، میرے آپ کے فکر سے کیا ہو سکتا ہے۔ لڑکیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں، کوئی نہ کوئی انھیں لے ہی جائے گا۔ لڑکے تو نکھٹو بن کے بھی رہ جاتے ہیں لیکن لڑکیاں تو کنگالوں کی بھی نہیں رہتیں" لیکن ماسٹر جی کو اپنی پتنی کی باتیں اس طرح محسوس ہوتیں جیسے کوئی تھوک سے بڑے پکا رہا ہو۔ وہ تو گھل گھل کر مردہ ہو گئے تھے، لیکن ان کی پتنی تو اب بھی بھگوان پر بھروسہ رکھے بیٹھی تھی۔ لڑکیوں کے فکر نے، ان کی شادی کی چنتا نے ماسٹر جی کو قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔

ماسٹر جی کی اس حالت کو دیکھ کر ان کی لڑکی سروج کو اپنے پتا پر ترس آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اس کے پتا جی جو دکھوں کی چکی پیس رہے ہیں۔ اس کا موجب وہ ہے۔ اگر وہ نہ ہوتی تو کیا انہیں اس قدر دکھ اٹھانے پڑتے، اس قدر صدمے سہنے پڑتے۔ وہ کالج میں پڑھتی تھی، اس کی پڑھائی کا کس قدر خرچ تھا۔ اس کی چھوٹی بہن اوشا دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ میٹرک پاس کر کے سروج کی کئی سہیلیاں دفتر میں نوکر ہو گئی تھیں۔ کیا وہ دفتر میں نوکر نہیں ہو سکتی؟ ہو سکتی ہے۔ اس خیال نے سروج کے من میں جوش اور ولولہ پیدا کیا تھا اور اسی جوش کے تحت اس نے کالج چھوڑ دیا تھا اور وہ ٹائپ کے اسکول میں ٹائپ سیکھنے لگی تھی۔ اتنی لگن اور محنت سے اس نے ٹائپ سیکھی کہ دو سالوں کا کورس۔ وہ چار مہینوں میں پاس کر گئی تھی، اور پھر وہ دفتر میں بھی ملازم ہو گئی تھی۔ اپنے پتا جی کی مدد کے لیے اس نے کس قدر ٹھوس راہ نکال دی تھی۔ وہ صبح

شام گھر کے کام میں اپنی ماتاجی کی مدد کرتی۔ سارا دن دفتر میں کٹ جاتا، اور رات کے وقت وہ ایف اے کی پڑھائی کرتی۔ اس کی زندگی بے حد مشغول تھی وہ نہایت سادہ کپڑے پہنتی تھی اور دفتر میں لنچ کے لیے بھی گھر سے ہی کھانا لیجاتی بس پر ایک پیسہ بھی فالتو ضائع نہ کرتی۔ وہ اپنے گھر سے دور سے دور اڈے سے بس پر سوار ہوتی اور گھر سے دُور سے دُور اڈے پر ہی اُتر جاتی۔ چند ہی مہینوں میں سروج نے گھر کی مالی حالت سدھار دی تھی اور ماسٹرجی کو محسوس ہوا تھا کہ جیسے ان پر تیزی سے آتا ہوا بڑھاپا رُک گیا ہو۔

روپے کی فکر ذرا کم ہوئی تو ماسٹرجی نے سروج کے لیے لڑکا ڈھونڈنے کی مہم شروع کر دی۔ وہ بے حد تلاش کے بھی اپنے کام میں کامیاب نہ ہوئے تھے انھیں زیادہ تر ایسے لڑکے ملے جنھوں نے یا تو ان کا مذاق اڑایا یا اپنی حد سے زیادہ مانگیں سنا سنا کر ڈرا دیا تھا۔ معمولی معمولی گھرانوں کے لڑکوں اور والدین کا دماغ کس قدر گھمنڈ سے، جھوٹی تمکنت سے بھرپور تھا۔ اس بات کا انھیں اب پتہ چلا تھا۔ زمین کی طرف تو کوئی دیکھتا ہی نہ تھا۔ رات کو سونے سے پہلے جب وہ اپنی مایوسیوں کا جائزہ لے کر اپنی بیوی سے باتیں کرتے تو ان کے من کی تلخی اور گہری ہو جاتی۔ ان کی بوکھلاہٹ جنون میں ڈھل جاتی اور غصے سے ان کے مونہہ سے جھاگ بہنے لگتی۔ انھیں کئی بار اپنی قسمت پر غصہ آتا اور کئی بار اپنی لڑکیوں پر۔ کاش ان کی بیوی بھی ان لڑکیوں کو جنم نہ دیتی، کاش ان کے بھی بیٹے ہوتے تاکہ وہ دنیا سے اپنے اس اپمان کا بدلہ لے سکتے۔ سروج کی ماں کے سمجھانے پر بھی ماسٹرجی کا ذہنی توازن ٹھیک نہ ہوتا۔ وہ ہراساں، ناامید، متفکر سارے زمانے کو گالیاں دیتے رہے۔

باپ کی اس گھبراہٹ اور مایوسی کی بھنک جب سروج کے کان میں پڑی تو

وہ ایک بار پھر محسوس کرنے لگی کہ نوکری کر کے بھی وہ اپنے پتا کے دکھوں کا حل نہیں کر سکی۔ ان کی شانتی کے لیے اسے ابھی کچھ اور کرنا ہوگا۔ اسے اپنے لیے ایک شوہر بھی ڈھونڈنا ہوگا...... وہ اب سیانی ہو گئی تھی اور زندگی کو تھوڑا تھوڑا سمجھنے لگی تھی۔ اسے احساس تھا کہ وہ لڑکی ہے۔ لیکن وہ لڑکی ہو کر بھی لڑکوں کے شانہ بشانہ چل رہی تھی۔ اگر وہ زندگی کے کارزار میں لڑکوں کے شانہ بشانہ چل سکتی ہے تو اس کی شادی بھی کیوں ماتا پتا کے فکر کا باعث بنے۔ وہ ان کے چین اور سکون کو کیوں بھنگ کرے۔ وہ ان کے لیے مسئلہ کیوں بنے۔ وہ اپنی راہ خود نکالے گی۔ اس کے دماغ میں سوچ کا چراغ جلتا ہے۔ اگر وہ بے حد حسین نہیں تو اس کی شکل اتنی بُری بھی نہیں وہ صحت مند بھی ہے۔ جوان بھی ہے۔ کماتی بھی ہے۔ اس میں کمی کیا ہے، جو مردوں کے مقابلے میں اس کی یوں بے قدری ہو۔ آخر مردوں میں ایسی کیا بات ہے۔ یہ تو منو کا بنایا ہوا قانون ہے جس نے مردوں کو زیادہ حقوق دے دیے ہیں وہ پتھر اور دھات کے زمانے میں تو پیدا نہیں ہوئی جو وہ ان دیواروں سے ڈرے۔ اس میں قصور اس کا اپنا بھی تھا کہ اس نے اپنی شخصیت کو ابھارا ہی نہیں تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے سوچا کہ جب تک وہ سادہ رہے گی پس پردہ رہے گی، لوگوں سے دور دور رہے گی وہ کسی کو بھی متاثر نہ کر سکے گی۔ اُسے سامنے اُبھر کر آنا ہوگا۔ اور خیال کی اس کرن نے اس کے تاریک مستقبل کو روشن کر دیا تھا اور سروج نے فیصلہ کیا کہ وہ پیچھے نہیں رہے گی، آگے بڑھے گی۔ اور پھر وہ آگے بڑھی بھی۔ نئے ولولوں کے ساتھ۔ مستقبل کے دامن کے لیے ارمانوں اور آرزوؤں کے پھول لے کر۔ اگلے مہینے کی پہلی کو اس نے ساری تنخواہ ماں کے حوالے نہ کی بلکہ اس میں سے کچھ روپے رکھ لیے اور بازار جا کر اپنے لیے جدید فیشن کا ریشمی سوٹ لے آئی۔ سوٹ کے ساتھ اسی رنگ کا اس نے دوپٹہ لیا اور ویسے ہی

جوتے، اور تھوڑا بہت زیبائش کا سامان بھی وہ لیتی آئی۔ اگلے ہفتے جب وہ نیا
سوٹ پہن کر چہرے کا میک اپ کرنے کے بعد اور ایک چوٹی کے بجائے دو چوٹیاں
گوندھ کر گھر سے نکلی تو اس کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جن آنکھوں نے اسے ہمیشہ
نظر انداز کیا تھا، آج اسے اشتیاق اور تحسین سے دیکھ رہی تھیں، اور دفتر
میں جہاں وہ گمنامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ جہاں اس کے ساتھ کام کرنے والے کبھی
اس کی جانب متوجہ نہ ہوئے تھے، وہاں یکایک اس کے چرچے شروع ہو گئے تھے۔
نگاہیں بولنے لگی تھیں اور ایک ساتھ سب اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بے تاب
ہو اٹھے تھے۔ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ کر اس کے ساتھ بولنے بیٹھنے کے موقعے تلاش
کرنے لگے۔ اب وہ دفتر میں اکیلی، اداس، خاموش نہ بیٹھی رہتی۔ اب اس کے ہونٹ
بھینچے اور نگاہیں جھکی اور سہمی نہ رہتی تھیں۔ اب ہر وقت کوئی نہ کوئی اس کے پاس
کھڑا یا بیٹھا رہتا تھا۔ اب کسی نہ کسی بات پر اس کے ہونٹ مسکراہٹ کی کلیاں کھلاتے
رہتے اور نگاہیں دلوں کے خرمن پر بجلیاں گراتی رہتیں۔ اب وہ چہک چہک کر
باتیں کرتی اور چہک چہک کر لوگوں کے فقروں کے جواب دیتی۔ اس کی اس بے باکی
اس خندہ پیشانی اور چہک دمک سے لوگوں کے دلوں میں آرزوؤں کے دیے
روشن ہونے لگے۔ انھیں اپنی مرادیں پوری ہوتی نظر آئیں۔ لیکن سروج لوگوں کی
مرادیں پوری کرنا نہ چاہتی تھی۔ اسے تو اپنے والدین کی فکر دور کرنا تھی۔ اپنے مستقبل
کی چولیں بٹھانے کی فکر تھی۔ اس لیے وہ اس دل کی تلاش میں تھی جو اس کا ہاتھ
تھام کر اسے زندگی کی اس منزل پر لے جانا چاہے جسے شادی کہتے ہیں اور
جہاں پہنچ کر محبت زندگی کے گل کھلاتی ہے اور پھول مرجھانے کے بجائے راحت
اور سکون کے پھلوں کو جنم دیتے ہیں۔

اس لیے سروج ہنستی بولتی سب سے تھی لیکن محبت کا وہ ہار جو اس کے

ارمانوں کا آئینہ دار تھا اس نے کسی کے گلے میں نہ ڈالا تھا۔ . . . . ہاں اسے محسوس ہو رہا تھا اس ہار کا حق دار پیدا ہو چکا ہے۔ ایش جو اس کے ساتھ ہی کام کرتا تھا، جو امیر باپ کا بیٹا تھا، جس کی بات چیت، جس کی چال ڈھال دفتر کے لوگوں سے بالکل مختلف تھی اس کی جانب کھنچا چلا آ رہا تھا۔ پہلے محض بات چیت کرتا تھا۔ پھر وہ اس کے پاس بیٹھنے لگا تھا، پھر اس نے سروج کو کینٹین لے جانا شروع کر دیا لیکن پچھلے ماہ سے تو وہ اس کے ساتھ بس اسٹینڈ تک جاتا تھا اور ایک دو بار اسے وہ کناٹ پلیس بھی لے گیا تھا۔ ایش اس کے مستقبل کا معمار، گردش کرتا ہوا اس کے دل کی وادی میں بڑی سرعت سے داخل ہوتا جا رہا تھا۔

اور جوں جوں وہ اس کے دل کی وادی میں داخل ہو رہا تھا۔ سروج کو ایک خاص طرح کی مسرت اور گدی گدی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے والدین کی ایک فکر اور دور کر دی ہے۔ ان کے سکون قلب کی ایک اور کڑی ڈھال دی ہے۔ اب وہ دن دور نہیں۔ جب انھیں معلوم ہو جائے گا کہ ان کی بیٹی نے انھیں اس آخری فکر سے بھی آزاد کر دیا ہے۔ جو ان کے بڑھاپے کا آزار بن گئی تھی۔ اب وہ لمحہ آیا ہی چاہتا ہے جب وہ اپنی ماں سے جا کر کہہ سکے گی "ماں، تم فکر نہ کرو۔ تم میرے لیے جو ڈھونڈ کے لانے کی فکر میں تھیں، میں خود ڈھونڈ لائی ہوں۔ اب اسے اپنے ہاتھوں سے مجھے سونپ دو۔"

اور اس شام لسے وہ لمحہ بہت قریب آتا نظر آیا۔ جب ایش نے یکا یک اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اور بولا "سروج اب میں یہ علیحدگی دو گھڑی برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہارے بنا میری زندگی کا ایک ایک پل ایک ایک برس کے برابر بیتتا ہے تم نے مجھے محبت دی ہے۔ اب زندگی بھی دے دو۔ مجھ سے شادی کر لو۔"

اور سروج ایک انوکھے نشے سے جھوم اٹھی اس کی تو مرادیں بر آگئیں! محبت کی ٹہنی پر پھول لگ گئے۔ میرا بھی کوئی بن گیا۔ میں بھی کسی کی ہو گئی! اور فرطِ انبساط سے اس کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک پیدا ہو گئی تھی اور چال میں ایک خاص طرح کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

اس کے بعد جو دن آئے وہ محبت سے لبریز تھے جو راتیں آئیں وہ خوابوں سے معمور تھیں اور جو لمحے آئے وہ عہد و پیمان کی سرگوشیوں سے بوجھل تھے۔ سروج اور امیش کی محبت دنوں دن گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ جو چیز سروج کی زندگی کا کبھی مسئلہ تھی اب دل کی بات بنتی جا رہی تھی۔ اب وہ بھی امیش کے بنا نہ رہ سکتی تھی۔ دفتر سے آنے کے بعد اگلے دن دفتر جانے تک اسے وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا۔ ادھر امیش اب شادی کے لیے دوسری وجہ سے بے تاب تھا۔ اس کی ماں بیمار رہتی تھی اور اس کے گھر والے اس کی شادی بہت جلد کر دینا چاہتے تھے اور اس پر بہت زیادہ دباؤ ڈال رہے تھے، اور وہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی ماں کے سامنے شادی ہو جائے اس لیے اب تقریباً روز ہی امیش شادی کی بات اٹھاتا۔ ایک دفعہ تو اس نے یہ بھی کہا کہ وہ خود اس کے ماں باپ سے جا کر مل لے گا۔ لیکن سروج ہی اسے روک لیتی۔ وہ متوسط گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کی راہ میں شرم و حیا حائل تھی۔ وہ نہ چاہتی تھی کہ یکایک اس کے ماتا پتا کے پاس کوئی اجنبی جا کر کہے کہ وہ ان کی لڑکی سے محبت کرتا ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ پہلے خود اپنی ماں سے کہنا چاہتی تھی اس لیے اس نے امیش کو روک دیا اور اسے تسلی دی کہ وہ خود اپنے ماں باپ کے کان میں بات ڈال دے گی۔ لیکن گھر پہنچتے پہنچتے نہ جانے اس کی قوتِ ارادی پر شرم و حیا کیسے حاوی آجاتی کہ وہ اپنی ماں سے کچھ نہ

کہہ پاتی۔ کئی بار اس نے کوشش بھی کی تھی، اس کی ہمت عود بھی کر آتی لیکن عین اس وقت کوئی اس کی ماں کے پاس آجاتی یا ماں اٹھ کر چل دیتی یا وہ کوئی دوسری بات شروع کر دیتی اور سروج کی بات بے آواز رہ جاتی۔

اس طرح کبھی ہمت اور کبھی مناسب موقع کے فقدان کی وجہ سے ایک ماہ گزر گیا اور سروج کچھ نہ کر سکی۔ لیکن ایک دن اچانک سروج نے پایا اس کے سامنے کوئی راہ نہیں ہے۔ اب دیر کی گنجائش نہیں ہے۔ امیش کی ماں کی حالت ایک ساتھ بے حد خراب ہو گئی اور ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ وہ پندرہ بیس دن سے زیادہ نہ جی سکے گی۔ اس بات پر امیش کے والد نے اعلان کر دیا کہ یا تو وہ اپنی پسند بتا دے، ورنہ وہ اپنی پسند سے اس کی شادی پندرہ دن کے اندر اندر کر کے رہیں گے۔ اور امیش نے یہی بات سروج کے آگے رکھ دی تھی "سروج اب میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اب تمھیں اپنے ماں باپ سے کہنا ہی ہوگا۔ مجھے کل تمہارا آخری جواب چاہیے۔"

اور کل صبح سویرے اپنا آخری جواب دینے کے لیے سروج دفتر بند ہونے سے پہلے ہی اپنے گھر چلی گئی۔ اب مجھے ماں کو بتانا ہی ہوگا۔ اب مجھے اس کی منظوری لینا ہی ہوگی۔ اب مجھے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر اپنے پیار دے کے لیے ان کی دعائیں لینی ہی ہوں گی۔ وہ گھر آئی لیکن گھر پر اس کی ماں کے پاس عورتیں بیٹھی تھیں وہ کام میں لگ گئی۔ جب عورتیں اٹھ گئیں تو اس کی ماں رسوئی میں آ گئی لیکن وہاں بھی اس کی بہن آ بیٹھی۔ وہ وہاں بھی نہ کہہ سکی۔ پھر رات آئی اور سب نے کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اس انتظار میں لگ گئی کہ اس کی ماں آئے تو وہ بات کرے لیکن آٹھ کے نو اور نو کے دس بج گئے، لیکن اس کی ماں اس کے پتاجی کے پاس ہی تھی، کیونکہ ان کی ٹانگوں میں باہ کا درد بڑھ گیا تھا۔ رات جاتے دیکھ کر

وہ بے تاب ہو اٹھی۔ اب اور وقت نہیں ہے۔ صبح مجھے جواب دینا ہے۔ کیوں نہ میں اندر جا کر خود ہی ان سے سب کچھ کہہ دوں۔ ایک عجیب و غریب قسم کی ہمت اس کے اندر پیدا ہو گئی اور بڑی سرعت سے وہ اپنے پتا کے کمرے کی طرف چل دی کمرے کے کواڑ بند تھے۔ وہ ان پر دستک دینے ہی والی تھی کہ اس نے سنا اس کے پتا کچھ کہہ رہے تھے، چپکے سے اس نے قریب جا کر سنا۔ وہ اسی کی بات کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے "میں نے فیصلہ کر لیا ہے، میں اب دو تین سال تک سروج کی شادی نہیں کروں گا۔ اس کی شادی تو ہو ہی جائے گی۔ لیکن چھوٹی کی شادی مشکل ہے۔ وہ نہ خوبصورت ہے نہ پڑھی لکھی۔ بنا جہیز کے اس کی شادی نہ ہوگی، اس لیے سروج جو کچھ دو تین سال تک کما لے گی اس سے چھوٹی کی شادی کر دوں گا اور جب اس کی شادی ہو جائے گی تب سروج سے کہوں گا اب تو آزاد ہے۔ جہاں چاہے شادی کر لے۔"

ان الفاظ کا سننا تھا کہ سروج کا سر چکرا گیا۔ اس کے جسم میں خون کی گردش یک لخت گر کر اتنی ماند پڑ گئی کہ اسے محسوس ہوا وہ کھڑی نہ رہ سکے گی زمین پر گر جائے گی بہ مشکل تمام دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے کمرے میں آئی اور دھم سے چارپائی پر گر پڑی

رات بھر وہ چارپائی پر پڑی رہی لیکن سو نہ سکی۔ اس کے ذہن میں خیالات کے کرگھے ارادوں کے نہ جانے کیسے کیسے اوٹ پٹانگ نمونے بنتے اور بگاڑتے رہے، کیا وہ ایش کو انکار کر دے۔ ہمیشہ کے لیے اسے کھو دے؟ سدا کے لیے اپنی محبت کی بستی اجاڑ دے؟ نہیں نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی، ایش اس کا مستقبل ہی نہیں محبت بھی ہے۔ وہ اس کے بنا جی نہیں سکتی۔ اسے اس سے شادی کرنا ہی ہوگی۔ لیکن اب کرگھے خیال کے الٹے نمونے بانے ڈالنے لگے۔ اگر میں نے شادی کر لی تو میری چھوٹی بہن اوشا کا کیا ہوگا؟ اس کی شادی کیسے ہوگی؟ بنا جہیز

کہ واقعی اسے کوئی نہ لے گا۔ تو کیا میں اپنی خوشی کی خاطر اس کا مستقبل تاریک کردوں؟
اسے ساری عمر کنواری رہ کر بوڑھی ہونے کے لیے چھوڑ دوں؟ میں بہن ہو کر اس
کے لیے وہ کروں جو کوئی ڈائن بھی نہ کرے گی۔ تو کیا میں ڈائن سے بھی بدتر ثابت
ہوں؟ نہیں نہیں میں ایسا نہیں کروں گی۔ وہ جو روپ میں ہیٹی ہے، بھاگ
کی پوچ ہے، عمر میں چھوٹی ہے۔ میں اسے اپنے سہارے کی اس روشنی سے محروم
نہیں کروں گی جو محض میں، اور صرف میں ہی اسے دے سکتی ہوں۔

اور جب صبح کی روشنی ہوئی تو اس کی الجھن ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی
بہن کے مستقبل کی خاطر اپنے حال کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

———•••———

لالہ اودے شنکر کی بیوی کا جب سے انتقال ہوا تھا، ان کی زندگی، زندگی نہ رہی تھی بلکہ وہ سارے کنبے کے لیے وبالِ جان بن گئے تھے۔ شریکِ حیات کی موت، نوکری سے ریٹائرمنٹ، بڑھاپے اور بیماری کے اتصال نے ان کی حالت ناگفتہ بہ کر دی تھی اب تو وہ اَن چاہے مہمان کی طرح دردر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے رہ گئے تھے۔ بظاہر انھیں کوئی کچھ نہ کہتا، لیکن حقیقت میں انھیں سب بیگار سمجھتے۔ کوئی زمانہ تھا کہ ان کی قدر و منزلت کا ستارہ پوری آب و تاب سے چمکتا تھا۔ ان کے آرام کے لیے کیا کچھ نہ کیا جاتا، وہ سو رہے ہوتے تو گھر میں سب کے موہنہ پر تالے لگ جاتے۔ سب دبے دبے پاؤں چلتے، کہیں ان کی نیند میں خلل نہ ہو۔ دفتر کی تیاری میں مصروف ہوتے تو گھر کے تمام افراد برق رفتاری سے ان کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو جاتے۔ کھانے پینے کے سلسلے میں ان کی پسند ناپسند کو اتنا دخل تھا کہ میں کوئی ایسی چیز نہ بنتی جسے وہ شوق سے قبول نہ کرتے اور پھر جب وہ شام کو گھر لوٹتے تو ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے گھر والے نظریں بچھائے محوِ انتظار رہتے۔ یہ سازگار ماحول پیدا کرنے میں کچھ تو لالہ جی کی اپنی عادات اور ایثار کا ہاتھ تھا اور کچھ ان کی بیوی کا، جو رات دن ان کی تعریف و توصیف

کرتی ہوئی ان کے رعب اور دبدبے کے افسانے فضا میں بکھیرتی رہتی، اور اسی مشترکہ ہمت اور سمجھوتے کا نتیجہ تھا کہ لالہ جی کے بیٹے ان کا احترام کرتے، بہوئیں ڈرتیں اور بچے خوف کھاتے۔

کہاں وہ زمانہ تھا، اور کہاں آج کا دور۔ اب نہ کوئی ان کی تعریف کرتا، نہ ان کی پسند ناپسند کو سامنے رکھ کر کھانا پکتا، نہ ان کے آرام کا کسی کو خیال تھا ڈرنا تو خیر بہت دور کی بات تھی۔ اب تو ان کا پہلا سا احترام بھی نہ رہا تھا۔ جس قدر انھوں نے کمایا وہ تو پہلے ہی گھروالوں کی پرورش میں لگ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حرص کے پتلے اب انھیں کسی توجہ کا مستحق نہ سمجھتے تھے۔ اب تو نوبت یہاں تک آپہنچی تھی کہ انھیں اپنے پاس رکھنے کے لیے بھی کوئی تیار نہ تھا۔ باری باری وہ سب لڑکوں کے یہاں تھوڑا تھوڑا عرصہ قیام کرکے اس بے قدری کو خود بھی دیکھ چکے تھے، لیکن اب وہ کرتے تو کیا کرتے۔ مجبوراً بڑے لڑکے کے ہاں موت کے انتظار میں وہ زندگی کے دنوں کو دھکا دے رہے تھے۔ جس قدر وہ موت کو بلاتے۔ اتنی ہی موت کی گھڑیاں دور ہوتی جاتیں۔ ان کے بڑے لڑکے کی بہو جو کسی زمانے میں ان کی بے حد خدمت کرتی تھی، اب ان کی سیوا کرنے سے یکسر موہنہ پھیر چکی تھی۔ نہ وہ ان کے کھانے کے بارے میں سوچتی، نہ ان کے آرام کی کوشش کرتی، وہ تو کسی نہ کسی طریقے سے لالہ جی کو بھگا دینے پر ادھار کھائے رہتی اور اس کا موجودہ رویہ بھی اسی سلسلہ کی ایک مضبوط کڑی تھا لیکن اس کی کوشش اور ارادے اس کے پتی کے رویئے کی بدولت بارور نہ ہو سکے۔ جب وہ یہی باتیں چھیڑتی تو جمبر گھر سے باہر چلا جاتا۔ دفتر بغیر کام کے جلدی پہنچ جاتا اور وہاں سے دیر سے لوٹتا۔ اس کی غیرحاضری میں شوبھا اپنی مہم سے باز نہ آتی۔ وہ بدستور کڑوے کسیلے جملے ہر گھڑی بکھیرتی رہتی۔ اس امید سے کہ کبھی

نہ کبھی کوئی تیر نشانے پر لگے گا۔ جب ان باتوں کی بھنک لالہ جی کے کان میں پڑتی وہ بوکھلا کر کانپنے لگتے، اور سوچنے پر مجبور ہوتے کہ یہ زندگی نہ جانے کن کرموں کی سزا ہے۔ انھوں نے تو خلوص سے زندگی بھر سب کی تن من دھن سے سیوا کی تھی لیکن آج ان کے بیٹے انھیں کس جرم کی سزا دینے کے سلسلہ میں ٹھکرا رہے ہیں۔ حتی الوسع انھوں نے تو کسی کا دل بھی نہ دکھایا تھا۔ تو پھر یہ بڑھاپا اور بیماری کیوں انھیں آج ذلیل و خوار کرنے پر اُتر آئے تھے، اگر ان کی بیوی زندہ ہوتی تو شاید ان کی یہ حالت نہ ہوتی۔ وہ پہروں چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے۔ اس مسئلے کے بارے میں بار بار سوچتے رہتے لیکن انھیں اس الجھن کا، اس مصیبت کا کچھ حل سجھائی نہ دیتا ہر طرف انھیں تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی، اور باوجود کوشش کے اس عالم مایوسی میں انھیں امید کی ہلکی کرن کی جھلک کہیں نظر نہ آتی۔

اور اسی ذہنی کوفت کی شدت سے گھبرا کر ہی انھوں نے یہ دنیا چھوڑ کر سنیاس لینے کا سوچا تھا اور فیصلہ کیا تھا جوں ہی ان کی صحت قدرے اچھی ہو وہ رشی کیش اپنے دوست کے پاس چلے جائیں گے، یہی ایک طریقہ تھا جس سے وہ اپنوں کی مشکلوں کا حل کر سکتے تھے اور اس سلسلہ کی تکمیل کے لیے انھوں نے سنجیدگی اور باقاعدگی سے دمے کے عارضے کا علاج کرانا شروع کر دیا تھا۔ اس آس پر کہ انھیں ذرا سا افاقہ ہو اور وہ اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنائیں۔

اور ابھی اسی کشمکش میں لالہ جی کی زندگی کے دن گزر رہے تھے کہ اچانک ان کا بھتیجا دنود انھیں حکیم جی کی دکان پر ملا۔ وہ ترقی کے سلسلہ میں کلکتہ جا رہا تھا۔ لیکن رہائش کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے اسے اکیلے ہی کلکتہ جانا پڑ رہا تھا۔ اسے دو مہینوں کے لیے کسی ایسے بزرگ کی تلاش تھی جو اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھر کی نگہبانی کر سکے۔ اس کے خاندان کی مدد کر سکے

لالہ جی اپنی علالت کے باوجود اپنے بھائی کے تحت، جگر کی درخواست رد نہ کر سکے۔ انھوں نے فوراً ہاں کر دی۔ اس فیصلے کے تحت دو اور چیزیں بھی کارفرما تھیں۔ ایک تو وہ حکیم جن کا وہ علاج کر رہے تھے، ونود کے گھر کے بالکل قریب تھا اور دوسرے وہ ذہنی آسودگی کے لیے بڑے لڑکے کے گھر کو چھوڑنا ہی چاہتے تھے۔ ان حالات میں ان کی ہاں ان کی ذہنی خوشی کا پتہ دیتی تھی اور انھوں نے اس لیے ونود کے ہاں اگلی شام چلے آنے کا وعدہ بھی کر دیا۔

اور گھر پہنچتے ہی انھوں نے شوبھا سے اپنے چلے جانے کی بات کہہ کر سامان کے باندھنے کے لیے بھی کہا تھا، کیونکہ بچے اسکول گئے ہوئے تھے اور بشمبر بھی گھر پر نہ تھا۔ شوبھا کا من یہ خبر سنتے ہی خوشی سے پھول گیا، وہ خوشی سے ناچنے لگی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے جیل کے دروازے ٹوٹ گئے ہوں اور بند کمروں کی گھٹن کی جگہ تازہ معطر ہوا کے جھونکے نے لے لی ہو۔ اسے ایک بار جان پڑا کہ اس کی زندگی کے باغ میں پھر سے بہار آگئی ہو۔ شام کو جب بشمبر گھر لوٹا تو شوبھا نے اسے بھی لالہ جی کے جانے کی خبر خوشی خوشی سنائی۔ بشمبر جیسے پہلے ہی جلا بھنا ہوا تھا وہ غصے سے چیخنے لگا اور غصے کے اس اظہار نے میاں بیوی کو اور الجھا دیا۔ ان کے مابین ہونے والی تکرار نے گھر کی فضا کو آن واحد میں مسموم کر دیا دونوں سپاہی اپنے اپنے محاذ پر ڈٹے رہے اس امید پر کہ جیت ان کی ہے

اور اگلی صبح بشمبر بنا کھائے پیے دفتر چلا گیا۔ شوبھا نے بھی اس کی جانب توجہ نہ دی نہ اسے زور سے کھانا کھانے کے لیے کہا۔ وہ بشمبر کی عادات سے بخوبی واقف تھی۔ اس لیے خاموش چارپائی پر بیٹھی رہی۔ اور جب لالہ جی حکیم کے پاس اور بچے اسکول چلے گئے تو اس نے لالہ جی کا سامان باندھنے کی طرف توجہ دی بستر تو لالہ جی خود باندھ کر رکھ گئے تھے، باقی سامان جو ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا

وہ اب شوبھا نے باندھنا شروع کر دیا۔ وہ تو مصمم ارادہ کیے ہوئے تھی کہ اب کے وہ ہرگز اسے نجات حاصل کرنے کے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے گی اور اس سلسلہ میں اگر اسے اپنے پتی کی ناراضگی بھی کچھ دنوں کے لیے اٹھانی پڑے وہ ہرگز ہرگز اس سے گریز نہ کرے گی۔ اس خیال کی سرسراہٹ نے اس کے ارادوں کے قلعے کو اور مضبوط کر دیا۔

اور پھر وہ لالہ جی کا سامان باندھنے میں جُٹ گئی۔ ابھی اس نے ایک دو چیزیں ہی لالہ جی کے ٹرنک میں رکھی تھیں کہ اس کی نظر بنک کی لال کتاب اور بنک کے بیس ہزار روپے کے حصّوں پر پڑی۔ وہ یہ کاغذات دیکھ کر چکاچوند رہ گئی۔ اس لمحہ اسے محسوس ہوا کہ لالہ جی کو گھر سے نکالنے کی غلطی کر کے وہ کتنی بڑی رقم سے ہاتھ دھونے والی تھی، اور پھر اس مہنگائی کے دور میں جب اسے دو چار روپوں کی اتنی تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے تو کیا وہ اتنی بڑی رقم کے لیے اس وقت کے تناول کو زہرمار نہیں کر سکتی، وہ من ہی من میں خوش ہو رہی تھی کہ اس کا لڑکا دیپک اسکول سے لوٹ آیا۔ وہ اسکول کی فیس لے جانا بھول گیا تھا اور اس لیے وہ اسکول سے چھٹی لے کر لوٹا تھا۔ فیس لے جانے کی بات تو شوبھا نے سُنی اَن سُنی کر کے دیپک کو بھی وہ کاغذ کے پھول دکھائے جنھوں نے ابھی ابھی اس کے دل و دماغ میں تازگی اور جسم میں حرارت پھونک دی تھی اور ماں بیٹا مل کر خوشی و مسرت سے جھومتے رہے، ناچتے رہے اور ارادوں کے ہوائی قلعے بناتے مٹاتے رہے کہیں دیپک کو انجنیر بنانے کا سپنا تھا اور کہیں اسے ڈاکٹری میں بھیجنے کا خیال اور کبھی یہ خیال بڑی بلڈنگ کے تعمیر کرنے پر اُتر آیا۔ جتنی خوشی سے شوبھا نے لالہ جی کا سامان باندھنا شروع کیا تھا۔ اتنی خوشی سے وہ اب اسے کھولنے لگی سامان کو ترتیب سے رکھنے کے بعد اس نے کمرے کو فنائل سے صاف کیا۔ لالہ جی

کا بستر کھول کر اس پر نئی سفید چادر بچھائی اور گندے کپڑے دھونے کے لیے غسل خانے میں ڈال آئی۔

دوپہر کو جب لالہ جی حکیم کی دکان سے لوٹے تو انھوں نے شوبھا کو پھر سامان باندھنے کی یاد دلائی، لیکن شوبھا ان کی بات سنی اَن سُنی کر کے ان کے لیے تازہ پھلکے پکانے لگی۔ پھلکوں کے ساتھ وہ لالہ جی کے لیے دودھ کی بالائی بھی رکھ لائی جو کسی زمانے میں لالہ جی کی محبوب ترین خوراک تھی۔ لالہ جی بڑی حیرانی سے کبھی اپنے صاف شفاف کمرے کو دیکھتے اور کبھی کھانے کی تھالی کی طرف ان کا دھیان چلا جاتا۔ لیکن وہ اس گتھی کو سلجھا نہ سکے۔ اور بڑے مزے سے کھانا کھاتے رہے جو لذیذ ہونے کے علاوہ گرم گرم بھی تھا۔ اور آج نہ جانے کتنے عرصے کے بعد انھیں نصیب ہوا تھا۔ شام کو جب دنود چاچا جی کو لینے آیا تو شوبھا بپھری ہوئی شیرنی کی طرح گرج کر بولی "نہیں لالہ جی نہیں جا سکتے۔"

"کیوں بھابی ایسی کیا بات ہے؟" دنود نے دھیمے سُر میں کہا۔ "وقت بے وقت اپنے ہی تو کام آتے ہیں، مجھے چچا کی سخت ضرورت ہے۔"

"وہ نوکر نہیں جو تمھارے گھر کی رکھوالی کریں؟"

"رکھوالی کی کیا بات ہے؟ کیا میرا چاچا جی پر کچھ حق نہیں۔"

"اتنے دن سے یہ حق کہاں تھا جو آج اس کی یاد آ گئی ہے۔ میں صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ ہمارے ہوتے وہ کہیں نہیں جا سکتے۔ پھر اس حالت میں جب کہ وہ بیمار ہیں لوگ کیا کہیں گے؟ ہم کنگال اور بھوکے نہیں جو انھیں دوسروں کے ٹکڑوں پر ڈال کر اپنی ناک کٹوائیں۔" شوبھا ابھی چیخ ہی رہی تھی کہ دنود الٹے پاؤں لوٹ گیا۔ حالاں کہ لالہ جی خود جانے کے لیے تیار تھے۔ اور بشمبر کرسی پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اگر لالہ جی چلے گئے تو اس کے ذہن کی حالت کیا ہو گی۔ شوبھا

اور اس کی زندگی میں آنے والا شگاف کیسے مندمل ہوگا۔ لیکن شوبھا کے اس رویے نے اسے حیران و ششدر کر دیا اور وہ ایک بار پھر سوچنے لگا کہ یہ عورتیں بھی عجیب مٹی کا خمیر ہیں۔ ان کو سمجھنا مرد کے بس کی بات نہیں۔ ابھی کل تک تو شوبھا لالہ جی کو گھر سے نکالنے پر تلی ہوئی تھی۔ لیکن آج یہ انھیں روکنے پر کمربستہ ہے۔ ایک لمحے میں نہ جانے یہ عورتیں کتنے رنگ بدلتی ہیں اور وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ شاید یہ اس کے صبح کے ستیہ گرہ کا نتیجہ ہو۔ وہ اس تبدیلی کو اپنی کامیابی سمجھ کر زیر لب مسکرانے لگا۔

بات چاہے کچھ بھی ہو، لیکن لالہ جی کی زندگی میں ایک بار پھر بہار آ گئی۔ ان کی پرانی قدر و منزلت کا ستارہ ایک بار پھر ان کی زندگی کے افق پر چمکنے لگا۔ ایک بار پھر ان کی پسند اور ناپسند کا علم لہرانے لگا۔ ان کی خوراک اور ان کے آرام کے لیے اب کنبے کے افراد پھر بے تاب تھے۔ اس سلسلہ میں شوبھا اور اس کے بچے لالہ جی کی پتنی سے بھی بڑھ گئے۔ لالہ جی کو ہر روز دُھلے دُھلائے کپڑے مل جاتے۔ بچھا بچھایا بستر میسّر ہو جاتا اور کھانا عین وقت تازہ بہ تازہ پیش ہونے لگا۔ اب لالہ جی کو ذرا بھی کہیں دیر ہو جاتی تو ان کی محبت سے پوچھ گچھ بھی ہوتی۔ اور انھیں تلقین کی جاتی کہ گھر والوں کے لیے نہیں اپنی صحت پر ترس کھا کر وہ زیادہ دیر باہر نہ رہا کریں۔ وقت پر دوا دارو کھائیں۔

اور یہ اسی تیمارداری اور دھیان کا نتیجہ تھا کہ لالہ جی موت کے غار سے نکل کر پھر زمین کے چمن میں چہکنے لگے۔ ایک نئی زندگی ان کے جسم میں ناچنے لگی۔ اس تبدیلی نے موت کا خیال تو یکسر ان کے ذہن سے نکال دیا، لیکن رشی کیش جانے کی دھن سے وہ نجات نہ پا سکے۔ کیوں کہ وہاں جانے کا وعدہ وہ کسی دوست سے کر چکے تھے۔ اور اس دوست کی جب کوئی یاددہانی کی چٹھی آتی تو پھر یہ ارادہ

ان کے ذہن میں منڈلانے لگتا۔ ان حالات میں جب وہ جانے کا ذکر کرتے تو شوبھا انھیں روک دیتی۔ لیکن وہ کب تک انھیں روک سکتی تھی اور پھر اس حالت میں جب کہ یہ رُکنے کے لیے کہنا محض دکھاوے پر مبنی ہو، اور پھر ایک شام لالہ جی نے جانے کے لیے شوبھا کی بھی اجازت حاصل کرلی۔

اور اس شام لالہ جی رشی کیش جانے کے لیے تیار تھے۔ کسی زمانے میں جو لالہ جی شوبھا کو برا سمجھنے لگے تھے، اب اس کا نیا روپ دیکھ کر بے حد خوش تھے، اور وہ اپنے بڑے لڑکے کو خوش قسمت سمجھتے تھے جسے ایسی بیوی ملی تھی، وہ رات دن اس کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہتے، حتی الوسع اس کے آرام کا خیال رکھتے، کبھی ناجائز تکلیف نہ دیتے۔ اتنے اچھے ماحول سے جدا ہونا ان کو اب شاق گزر رہا تھا۔

بشمبر جب لالہ جی کو اسٹیشن پر چھوڑنے کے لیے تانگہ لینے گیا تو بچوں نے لالہ جی کا سامان برآمدے میں رکھ دیا اور شوبھا ان کے لیے رستے میں کھانے کے لیے کھانا باندھنے لگی۔ کمرے میں لالہ جی اداس اداس سے چپ چاپ بیٹھے تھے اور اس خاموشی کی مہر کو شوبھا نے ہی توڑا " پتاجی!

" ہاں بیٹی " لالہ جی نے سوکھے گلے سے جواب دیا۔

" تو پھر اب آپ رشی کیش چلے ہی جائیں گے ؟"

" ہاں بیٹی — یہ میری پُرانی خواہش ہے۔ اب مجھے جانے دو ۔۔۔۔ لیکن تم ۔۔۔۔ تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو ؟ "

" ہاں پتاجی۔ اس وقت آپ سے اپنے لیے نہیں دیپک کے لیے کچھ مانگ رہی ہوں "

" مجھ سے مانگ رہی ہو؟ میرے پاس تو آشیرواد کے سوا کچھ نہیں بیٹی "

"اس طرح نہ کہیے تپاجی۔ آپ کے پاس سب کچھ ہے" شوبھا نے بڑے لاڈ سے کہا۔

"نہیں بیٹی میں جھوٹ نہیں کہہ رہا، تم نے جو میری سیوا کی ہے اس کا پھل میں تمھیں اور تمھارے بچوں کو نہیں دے سکتا۔ میرے پاس پرانے کپڑوں کے ان دو ٹرنکوں کے سوا رکھا ہی کیا ہے، کاش میرے پاس کچھ ہوتا" لالہ جی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ کے پاس بنک کے بیس ہزار کے شیر اور آٹھ ہزار کی کاپی تو ہے" شوبھا نے جرارت کر کے کہہ ہی ڈالا۔

"شیر ۔۔۔ ؟ شیر؟ اوہ تم اس بینک کے شیروں کی بات کرتی ہو بیٹی جو کبھی کا فیل ہو چکا ہے؟ اور وہ پاس بک۔ وہ تو بنک کے اس حساب کی پاس بک ہے جس سے میں یہ سارا روپیہ نکال چکا ہوں صرف اندراج کرانا بھول گیا؟"

نرمل کے پتا جی شروع ہی سے بہت سخت طبیعت کے مالک تھے۔ ہوکول ماسٹری نے ان پر اور پانی چڑھا دیا تھا۔ اسکول سے لوٹ کر وہ گھر کو بھی اسی ماحول میں ڈھال دیتے ڈانٹ اور پھٹکار کا سلسلہ بات بغیر بات چھڑ جاتا۔ پدری شفقت کو بالائے طاق رکھ کر وہ یوں آنکھیں دکھاتے کہ توبہ ہی بھلی۔ بچے اگر اس قہر سے بچ جاتے تو ان کی بیوی کی شامت آجاتی۔ وہ اس ڈرامے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور ڈھونڈ لیتے، یہ چاہے ان کے جوتے کا ادھر ادھر ہونا ہو یا ان کی کتابوں کا بکھرنا۔ اور اکثر یہ ناٹک نرمل کی والدہ کے آنسوؤں سے ختم ہو جاتا، مگر اپنی تلخی اور اپنا زہر ضرور چھوڑ جاتا۔ میاں بیوی بڑبڑاتے رہتے۔ گھر کی فضا میں کھنچاؤ رہتا اور سہمے سہمے بچے جہاں کھڑے ہوتے وہیں دبک کر بیٹھ رہتے۔ ان معرکوں میں جب سے نرمل نے ہوش سنبھالا تھا وہ اپنی ماں کی ہمدرد بنتی، اور یہی ہمدردی کا اظہار آہستہ آہستہ باپ سے نفرت میں ڈھل گیا تھا۔ اسی نفرت نے نرمل کو مردوں سے نفرت کرنے کا احساس دلایا تھا اور یہ اس کے دل و دماغ میں پختگی سے سماگئی تھی حساس ہونے کے کارن وہ ہر بے انصافی کے خلاف تھی، اور اپنے نظریوں کی تکمیل کے لیے وہ خود اعتمادی سے وہ اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس نے

تہیہ کیا تھا کہ وہ نہ خود مردوں کے ظلم سہے گی اور نہ اپنی کسی ہم جنس کو اس چکی میں پسنے دے گی۔ منو کا بنا ہوا راستہ اسے بدلنا ہوگا۔ اور وہ ایسی مثال پیش کرے گی جس سے آئندہ آنے والی نسلیں اسے احترام اور عزت سے یاد کریں گی۔

اسی منزل کو سامنے رکھ کر اس نے بی اے۔ بی ٹی کیا اور پھر چھوٹے پیمانے پر دلّی میں لڑکیوں کا اسکول کھول دیا، کیونکہ اسے خیال تھا کہ تعلیم ہی سے عورتوں کے دکھوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اس ننھے منّے اسکول کی وہی ٹیچر بھی، وہی کلرک اور وہی پرنسپل۔ اور آج وہی چھوٹا سا اسکول بڑھتے بڑھتے اتنے وسیع پیمانے پر نیو انڈیا گرلز اسکول بن گیا تھا۔ اس اسکول میں دو ہزار لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ پچاس کے قریب استانیاں تھیں چار کلرک اور تین چپراسی بھی۔

اسکول کی اپنی عمارت تھی، اپنا ہال، اپنی لائبریری اپنے کھیلنے کے میدان اور اپنا اثاثہ اور پھر رات دن کی محنت نے اسکول کو ایسی بلندی پر پہنچا دیا تھا کہ دس سال پہلے اس کا تصور بھی مشکل تھا۔ خود نرمل بہت محنت کرتی تھی اور دوسروں سے امید رکھتی تھی کہ وہ بھی اسی معیار پر پوری اُتریں۔ جو کوئی بھی اس معیار پر پورا نہ اُترتا جلد ہی چھٹی پا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ پچھلے دس سالوں میں سو استانیاں بدل چکی تھیں۔ کوئی چپراسی سال بھر نہ رہا تھا۔ اور کلرک تو ہر مہینے بدل جاتے۔ ویسے تو اسکول ایک انتظامیہ کمیٹی کے ماتحت چل رہا تھا، لیکن اس کی کرتا دھرتا پرنسپل نرمل ہی تھی۔

نرمل کی زندگی گھڑی کی طرح چل رہی تھی۔ وہی علی الصبح اٹھنا۔ کافی کے پیالے پی کر سیاسی کتابیں پڑھنا اور پھر اسکول کے دھندوں میں اُلجھ جانا۔ پچھلے کئی برسوں سے اس کے اس پروگرام میں ذرا سا بھی فرق نہ آیا تھا اور لگاتار کامیابیوں نے نرمل کو مغرور اور بد دماغ بنا دیا تھا۔ وہ لوگوں سے سیدھے مونہہ بات کرنا بھی

توہین سمجھتی۔ اسی خود پرستی اور رعونت نے اس کے ماتھے پر تیوریوں کو مستقل طور پر ثبت کر دیا تھا۔ انھیں کی وجہ سے اس کی اچھی صورت بھی خوف ناک دکھائی دیتی تھی اسکول میں وہ جس طرف سے گزرتی لڑکیاں اور استانیاں راستہ چھوڑ دیتیں اور اس کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ سب چیزیں قرینے سے رکھی جانے لگتیں۔ کمروں کو صاف کیا جانے لگتا۔ نرمل کے بھتیجے بھتیجیاں ڈر کر یوں بیٹھ جاتے جیسے بلّی کے آنے پر کبوتر۔ نرمل گھر میں، بازار میں ایک ہی انداز میں گردن اکڑائے اور موہنہ پھلائے چلتی جیسے وہ نیو انڈیا اسکول کی پرنسپل نہیں سارے شہر کی ملکہ ہے۔ پرنسپل ہونے کا احساس اسے کبھی نہ چھوڑتا۔ اس کی ہر بات سے رعب اور دبدبے کی بُو آتی۔ اسی احساس کی شدت نے لوگوں کو اس سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس لیے اکثر لوگ اس کے چلے جانے کے بعد اسے موہنہ چڑاتے اور کچھ بُرے الفاظ بھی کبھی کبھار زبان سے نکال کر دل کی بھڑاس نکالتے۔

لیکن وہ اُسی لگن سے اسی انداز سے اپنی راہ پر چلی جا رہی تھی۔ ان ہلکی ہلکی باتوں کا اس پر کچھ اثر نہ تھا۔ وہ چٹان تھی، دیوار تھی۔ اس کے لیے جھکنا کسرِ شان تھا۔ اسے اپنی خود اعتمادی پر اپنی لیاقت پر اور اپنی باتوں پر یقین ہی نہیں تھا۔ بلکہ فخر تھا۔ اور یہی احساس یہی جذبات یہی نقطۂ نظر وہ اپنی ہم جنسوں میں پھونکنا چاہتی تھی یہی اس کا نصب العین تھا اور یہی منزل۔ اسی منزل کی جانب وہ اپنے ماحول سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھ رہی تھی ہر قدم اس کے احساس کو پختگی دے رہا تھا۔ اس کے ارادے بلند ہو رہے تھے۔ اسکول اب ایسی منزل پر پہونچ چکا تھا کہ اُسے اس کے لیے زیادہ دقّت نہ اُٹھانی پڑتی۔ اس نے اسکول کی مشینری کا ہر پرزہ دیکھ بھال کر فٹ کیا ہوا تھا۔ اب اتنی کڑی نگرانی کی ضرورت نہ تھی۔ رات دن

محنت کرنے والی نرمل کو اب محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی فارغ ہو گئی ہے فرصت کے لمحات ایک مسئلہ بن گئے تھے۔ اس کی محبوب سیاسی کتابیں کھلونے کی طرح پھیکی پھیکی ہو گئی تھیں۔ اس کے لب و لہجے کی کرختگی اور ناخوشگواری کے باعث گھر اور باہر کوئی بھی اس سے بے تکلف ہونا پسند نہ کرتا تھا۔ سب اسے دیالِ جان تصور کرتے تھے۔ ان فرصت کی گھڑیوں کو تن تنہا بطریقِ احسن گزارنے کے لیے اس نے اب ایک موٹر سائیکل بھی خرید لی تھی۔ جب — طبیعت پر ذرا سی گرانی محسوس ہوتی وہ فوراً سائیکل اٹھا کر گھومنے چلی جاتی، یا یوں ہی محکمہ تعلیم کے چکر لگا آتی۔ شہر کی ادبی سیاسی اور تہذیبی میٹنگوں میں شرکت کرنا بھی اس نے شروع کر دیا تھا۔ مگر وقت تھا۔ پھر بھی بچ رہتا۔

اور یہی فرصت اس کی جان کا روگ بن گئی تھی۔ اسی فرصت میں اسے احساس ہوا کہ وہ ترسی ہوئی ہے، محبوس ہے۔ اسی الجھن میں پھنسی ہوئی وہ نہ جانے کیا سوچتی رہتی اُسے اپنی نس نس تھکی تھکی محسوس ہوتی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کسی سے باتیں کرے باتیں جو اسکول کے بارے میں نہ ہوں، باتیں جو ڈانٹ پھٹکار نہ ہوں، باتیں جو نرم ہوں، کومل ہوں، بے معنی ہوں۔ باتیں جو اس کے گھٹے ہوئے وجود کا حبس دور کریں۔ اس کا دل چاہتا کہ کوئی اس کی باتیں سنے اور اس کے باطن کو جانے، کوئی اس کی خوشی اور دلچسپیوں میں شریک ہو۔ مگر اس وسیع دنیا میں کوئی اس کا غم گسار نہ تھا۔ غم گسار نہ ہونے سے اسے ہر جانب تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی تھی۔ وہ محسوس کرتی کہ وہ زندگی کی دوڑ میں اکیلی رہ گئی ہے۔ دھیرے دھیرے مردوں کے خلاف، ماحول کے خلاف جو جذبات اس کے دل میں تھے وہ اب مدھم پڑ رہے تھے۔ وہ اب انسانوں سے، اردگرد رہنے والوں سے، سب سے محبت کرنا چاہتی تھی۔ اب وہ اسکول ٹیچروں کو، چپراسیوں کو اور کلرکوں کو یوں ہی نہ نکالتی تھی۔ بلکہ ان کی

غلطیوں کو معاف کر دیتی۔ ان کے دُکھ درد میں شریک ہوتی۔ اسکول کی لڑکیوں پر کیے ہوئے بڑے بڑے جرمانے معاف کر کے اسے بڑی خوشی ہوتی بھابی اور اس کے بچوں سے پیارے باتیں کرنے میں اسے بڑی طمانیت ملتی۔ نفرت کا کانٹا اس کے سینے سے نکل چکا تھا۔ اب وہ مجسّم محبت کا اوتار بن رہی تھی۔ ان جذبات سے اس کا دل دھڑکتا تھا۔ مگر روز بروز اس کے سینے کی یہ خلا بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

اسی خلا کو بھرنے کے لیے اس نے کیا نہ کیا۔ اب اس کا پہلے سا پہننے کا ڈھنگ نہ تھا۔ اسے اچھے اچھے کپڑے پیارے لگتے۔ بکھری بکھری زلفیں سنور گئی تھیں۔ اس کی نگاہوں سے وحشت کی جگہ محبت ٹپکتی تھی۔ ماتھے کی تیوریاں غائب ہو گئی تھیں، اس کے ہونٹوں پر معصومیت میں بھیگی ہوئی مسکراہٹ ابھرتی اور فضاؤں میں بکھر جاتی۔ ابھی تک دیکھنے والوں کو اس کا احساس نہ تھا۔ وہ اسے وہی پرانی نرمل سمجھتے اب وہ بلا ناغہ کناٹ پیلس جانے کو بُرا نہ سمجھتی۔ فلمیں دیکھتی کبھی کبھار ہوٹل میں چائے بھی پی لیتی۔ اور سیاسی کتابوں کی جگہ وہ اب ادبی کتابوں کی شوقین ہو گئی تھی۔ اچھے ناول اور کہانیاں اسے علم کے خزانے دکھائی پڑتے جن سے وہ لطف اٹھاتی۔ اسے ذہنی سکون ملتا۔ اس کی سوکھی ہوئی نسیں پھر تازہ بتازہ اور نو بنو ہو جاتیں، ان کا مطالعہ کرتے کرتے اسے محسوس ہوتا کہ وہ زندگی کے تپتے ہوئے صحراؤں سے جان بچا کر بھاگ آئی۔ زندگی میں اس کے لیے اندھیرا کم ہو گیا تھا۔ اس نے اب جان لیا تھا کہ زندگی نفرت نہیں محبت ہے، پیار ہے، میٹھی میٹھی مہک بھری ہوا کا جھونکا ہے پھول ہے، جس میں کانٹے بھی ہیں۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے اس نے کئی مہینے گزار دیے مگر اس کے سینے میں لہرانے والی خلاء اب بھی وہیں تھی۔

ایک شام حسبِ معمول وہ کالج سے لوٹ کر صوفے پر سستا رہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ نرمل نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اس کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی

جب اس نے دیکھا کہ اس کا کالج کا ساتھی رمیش وہاں کھڑا ہے۔ "ہلو رمیش" کہہ کر اس نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔ رمیش سے مل کر وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ بھابی کو چائے لانے کے لیے کہہ کر وہ رمیش کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ کالج کی باتیں، زندگی کی باتیں، سماج کی باتیں، ان باتوں میں وہ پہلے تو رمیش سے پوچھنا ہی بھول گئی کہ وہ کیسے آیا ہے۔ آخر اس نے پوچھ لیا "کہیے کیسے آنا ہوا؟"

رمیش نے اپنے پرانے انداز سے جواب دیا "یوں ہی گھومنے پھرنے۔ دلی دیکھنے" اس کے ہونٹوں پر ہلکی شرارت ناچ رہی تھی۔

نرمل کو اس کی بے تکلفی اور اندازِ گفتگو پر پیار آ رہا تھا۔ اس نے چھٹتے ہی اسے اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دے دی۔ دعوت دے کر وہ بہت خوش ہوئی اور رمیش کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ اور جب رمیش نے کہا کہ "مجھے کوئی اعتراض نہیں" تو وہ فرطِ مسرت سے جھومنے لگی۔ جیسے اسے کوئی کھویا خزانہ مل گیا ہو۔ اس کے بعد رمیش نرمل کے ہاں ٹھہرا۔ دونوں نے مل کر دلی کی خوب سیر کی۔ دونوں نے مل کر فلمیں دیکھیں، ہوٹلوں میں چائے پی، موٹر سائیکل پر گھوم گھام کر وہ رات کا کھانا مل کر کھاتے۔ گپیں ہانکتے اور پھر چین سے سو جاتے۔ اس زندگی میں کتنا لطف تھا نرمل کو محسوس ہوا کہ خوشی سے دھرتی اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی ہے۔ جب کبھی رمیش جانے کے لیے کہتا تو نرمل اسے صرف ایک دن اور ٹھہرنے کے لیے کہہ دیتی۔ رمیش بھی بغیر حیل و حجت کے مان جاتا۔ نرمل کے سینے کی خلاء پُر ہو رہی تھی وہ مسرور تھی، مطمئن تھی۔ اس کی تھکی تھکی نسیں تازہ دم ہو گئی تھیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے رمیش نے بھی جانے کا ذکر چھوڑ دیا تھا اور اب نرمل کو بھی "ایک دن تو اور ٹھہر جائیے" کہنے کی ضرورت نہ رہی۔

— —
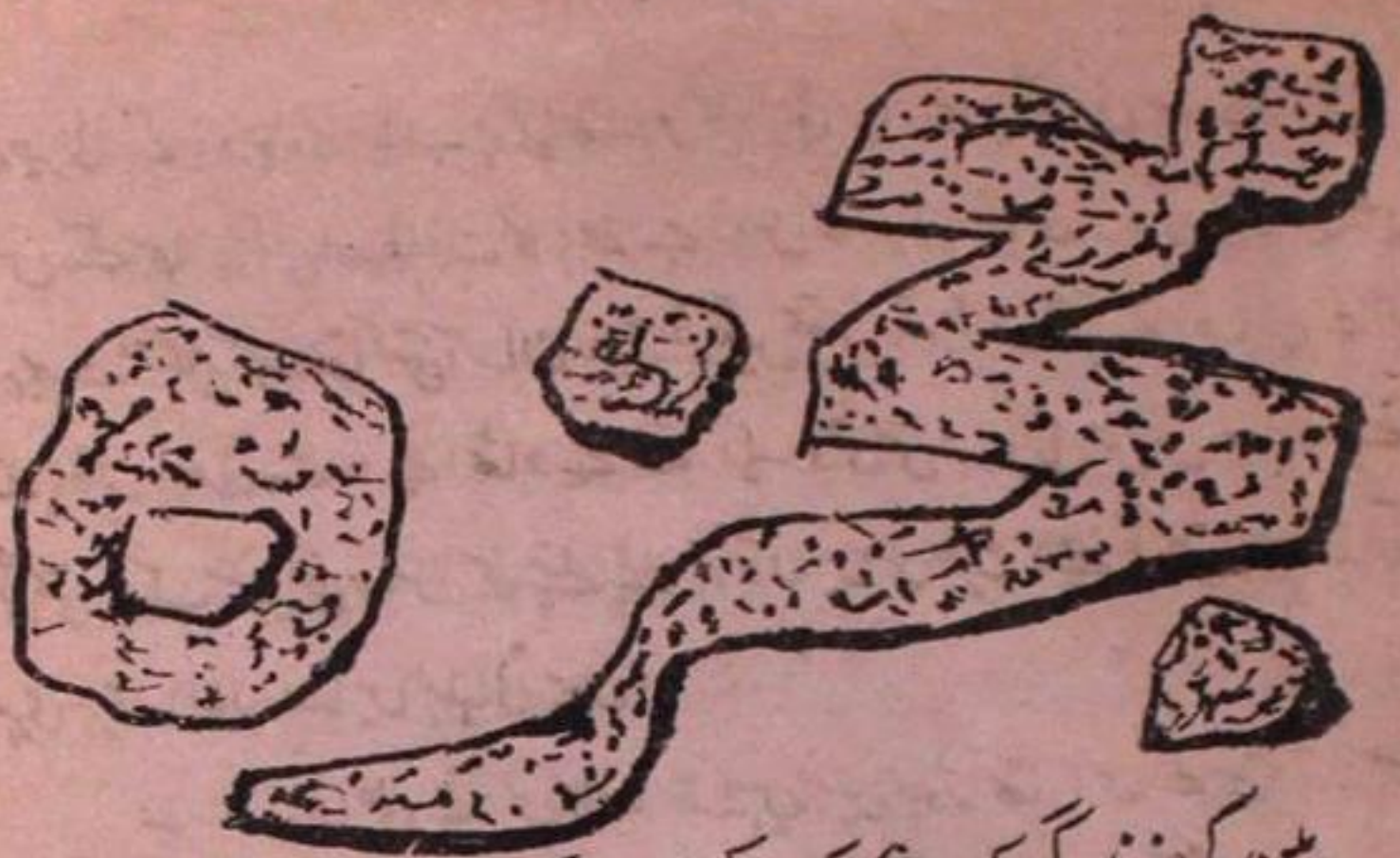
بپن کی زندگی کی ہر مشکل کسی نہ کسی معجزے کی بدولت حل ہوتی رہی تھی۔ جب
اس کے ماں باپ نے اس کا ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑا تو شفیق چچی اور چچا اسے مل گئے
اور یتیم بچّہ زندگی کے مسموم بگولوں کی زد سے بچ گیا اور اسے بڑے بھائیوں اور بھابیوں
کے عتاب نہ سہنے پڑے۔ یہ اس کی خوش نصیبی تھی یا قدرت کا چمتکار کہ اس کے چچا کے
ہاں کوئی بچّہ نہ تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی چچی نے مادرانہ شفقت سے بپن کو
اس طرح پالا جیسے وہ اس کے اپنے ہی ماس کا لوتھڑا ہو۔ چچی اور چچا نے کبھی اسے ماں
باپ کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اس کی ہر خواہش اور چاؤ کو ہر طریقے سے پورا کیا
جاتا تھا۔ خدانخواستہ اگر اُسے کوئی بیماری آگھیرتی تو چچا چچی دونوں آنکھوں
میں طویل راتیں گذار دیتے۔ اس بے انتہا محبت اور پیار نے بپن کی عادات بگاڑ
دی تھیں۔ انتہائی طور پر ذہین ہوتے ہوئے بھی وہ پڑھائی میں اچھی طرح نہ چل سکا۔
پڑھائی کی جگہ اسے گھومنے پھرنے کا چسکا تھا وہ رات دن دوستوں کے ساتھ ہوٹلوں
میں موج اڑاتا، سینما دیکھتا یا پھر کالج کی لڑکیوں کے ساتھ کناٹ پلیس کے "چکر" لگاتا
چچا کے بہت کہنے سننے پر اس نے بی۔ اے کے امتحان کا داخلہ بھیج دیا تھا۔ لیکن ایک
بار پھر کسی غیبی طاقت نے معجزہ دکھایا تھا اور بپن اپنی امیدوں کے خلاف اور لوگوں

کی حیرانی کے باوجود کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کامیابی پر اسے خود محسوس ہوا تھا کہ اس میں اس کے بجائے کسی اور طاقت کا ہاتھ ہے۔ اس کامیابی کے بعد زندگی کی راہیں جنھیں وہ بہت مشکل سمجھتا تھا کتنی آسان نظر آنے لگیں تھیں۔ گھمنڈ اور تکبر کے احساس نے اس کے پاؤں دھرتی سے اونچے اٹھا دیے تھے۔ ایک خوشی تھی جو اس کی نس نس میں سرسرانے لگی تھی۔ ایک ہنسی تھی جو اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر اس طرح ناچنے لگی تھی جیسے گندم کی ہری ہری بالیاں فضا میں لہلہاتی ہوں۔

فطرت کی فیاضی نے اس کا ساتھ یہیں نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے سبزہ زار میں معجزوں کے اور پھول تھے۔ جو اس نے بپن کی زندگی میں کھلائے۔ بپن کی کوئی سفارش نہ تھی کوئی تجربہ نہ تھا، کوئی ٹیکنیکل سند نہ تھی لیکن ان کے باوجود اسے چار سو کی ایک نوکری مل گئی تھی۔ وہ خود اپنی قسمت پر حیران تھا۔ یہ نوکری بے شک عیوضی تھی لیکن تھی تو اچھی۔ دھیرے دھیرے وہ اور ترقی کر جائے گا عیوضی نوکریاں ہی تو بعد میں مستقل ہوتی ہیں۔

اور پھر کچھ ہی دن بعد جب اُس کی شادی ایک مشہور اور حسین گانے والی اجیت سے ہو گئی تب اس کا یقین ان معجزوں میں اور بھی بڑھ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ قدرت لوگوں کو حیران اور پریشان کرنے کے لیے اس پر خاص مہربان ہے۔

بپن تو خیر اچھی تنخواہ لیتا ہی تھا۔ لیکن اجیت کی آمد نے ان کی آمدن اور بڑھا دی تھی اجیت بہت اچھا گاتی تھی۔ موسیقی کی مجلسوں میں اس کی ترنم ریزیوں نے تہلکہ مچا رکھا تھا۔ شادی سے پہلے بھی اجیت بمبئی کی کئی ایک فلموں میں بطور پلے بیک سنگر کام کر کے اچھے پیسے کما چکی تھی۔ کئی ایک گراموفون کمپنیوں نے اُس کے گیت ریکارڈ کر رکھے تھے۔ اب ریڈیو سے اس کے گانے نشر ہوتے تھے۔ ہر دوسرے چوتھے دن ایک نہ ایک ادارے سے رائیلٹی کا چیک پہنچ جاتا۔ یہ معجزہ نہیں تھا تو اور کیا تھا۔ بپن کی زندگی

کا ہر مہرہ عین ٹھکانے پر پڑا تھا۔ اس نے زندگی میں آنے والی ہر مصیبت کو مات دے دی تھی۔ وہ خوش تھا کیونکہ اس کے دن رات خوش تھے۔ اچھا گھر۔ اچھی بیوی اور اچھی آمدنی۔ زندگی میں ہر طرح کی آسودگی ہی آسودگی تھی۔ اور انسان کو چاہیئے بھی کیا۔

اور معجزے یہیں پر ختم نہ ہو گئے تھے۔ بپن کے دونوں بڑے بھائیوں کے ہاں پہلے تین تین لڑکیاں تھیں۔ پھر کہیں لڑکے ہونے کی باری آئی تھی۔ لیکن اجیت کا پہلا ہی بچہ لڑکا ہوا تھا۔ یہ بھی تو ایک معجزہ ہی تھا۔ کہ اس نے خاندان کی لڑکیاں پیدا کرنے کی ریت توڑی تھی۔

لیکن ایک دن اس کی فیاض زندگی نے، معجزہ دکھانے والی شکتی نے اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ بپن کی عیوضی نوکری ختم ہو گئی۔ لیکن جھوٹی تمکنت کے زیر اثر اس نے اپنی نوکری کے خاتمے کا ذکر اپنی بیوی سے نہ کیا۔ معجزوں میں اس کا یقین اس حد تک پختہ ہو چلا تھا کہ اُسے امید تھی اسے جلد ہی دوسری نوکری مل جائے گی اور اسے اپنی بیوی کو یہ بتلانے کی ندامت نہ اٹھانی پڑے گی کہ وہ کچھ عرصہ کے لیے بے کار ہو گیا تھا۔ اپنی بیکاری کے اس عارضی دور کو بیوی سے پوشیدہ رکھنے کے لیے اس نے ایک خاصی کامیاب اسکیم بنائی تھی۔ وہ بدستور دس بجے صبح گھر سے نکل جاتا اور دن ڈھلے گھر لوٹتا۔ باقاعدہ پہلی تاریخ کو اپنی تنخواہ کے برابر پیسے لاکر اپنی بیوی کے حوالے کر دیتا یہ تنخواہ اسے کسی دفتر سے نہ ملتی تھی بلکہ وہ بنک سے اپنے جمع کیے ہوئے اثاثے سے یہ روپے نکلوا کر لا رہا تھا۔ بیاہ ہوتا تو چھٹی کی جھوٹی عرضی غلط پتہ پر بھیج دیتا۔ ضروری کام کے لیے بھی چھٹیاں لینے کی عرضی اپنی بیوی کے سامنے لکھتا اپنی ذہانت سے اس نے کچھ اس طرح کا جال بچھایا تھا کہ سال گذر گیا اور اجیت کو گمان بھی نہ ہوا کہ وہ بیکار رہے بظاہر وہ پہلے کی طرح خوش و خرم نظر آتا تھا۔ اپنی نوکری کے خاتمے کے بارے میں ذکر کر کے اپنی عزت اور وقار کو ٹھیس لگانا اسے گوارا نہ تھا۔ لیکن اب کے بات

بن کے نہ دیتی تھی معمولی نوکری کرنا اُسے گوارا نہ تھا۔ اچھی نوکری اُسے ملتی نہ تھی۔ وہ عجیب مخمصے میں الجھا ہوا تھا۔ اسے کچھ نہیں سوجھائی دیتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ جب تک بینک میں پیسہ رہا اسے اصل میں سوجھا بھی نہیں۔ لیکن جب بنک کی رقم ختم ہونے کے قریب پہنچی تو اسے دھڑکا ہوا کہ اب اس کا راز افشا ہو جائے گا۔ راز جاننے پر اجیت کیا کہے گی، اس خیال کے احساس نے اسے بُری طرح پریشان کرنا شروع کر دیا اندر ہی اندر یہ اندیشہ اسے دق کے جراثیموں کی طرح کھانے لگا روز بروز اس کی صحت گرنے لگی۔ اس کا گلاب سا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دینے لگا۔ کئی بار اس کے جی میں آیا کہ وہ اجیت سے کہہ دے کہ وہ بیکار ہے۔ کم از کم اس کے دل کا بوجھ تو ہلکا ہو گا۔ لیکن وہی جھوٹی تمکنت اس کے راستے میں چین کی دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی۔ اس کے علاوہ اس کا معجزوں میں ایمان ابھی تک کمزور نہ پڑا تھا اُسے اب بھی امید تھی کہ معجزہ ضرور ہو گا۔ وہ اس کی عزت و منزلت کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھال لے گا۔ لیکن چہرہ روح کی کیفیت کی غمازی کر ہی دیتا ہے۔ اجیت کو ایک دن محسوس ہوا بپن بالکل نارمل نہیں ہے۔ اس لیے اس نے پوچھ ہی لیا "آپ کیسے رہتے ہیں آج کل؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟"

"کچھ بھی نہیں" بپن نے جواب دیا تھا۔

"کچھ کیوں نہیں؟ ضرور کوئی بات ہے آپ مجھ سے پردہ رکھتے ہیں" اجیت نے اصرار کے لہجے میں کہا۔

"پردہ؟ کیسا پردہ؟ کوئی بات ہو تو بتاؤں" بپن نے بناوٹی لاپرواہی سے کہا تھا۔

لیکن اس کا دل بُری طرح دھڑک اٹھا۔ اسے محسوس ہونے لگا، جیسے اب

وہ اپنی بیکاری کے راز کو زیادہ دن نہ چھپا سکے گا۔ اب اُسے فوراً کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا ورنہ اجیت کو بتا دینا ہوگا کہ وہ کس طرح ایک سال سے اس کے ساتھ دھوکے کا کھیل کھیلتا رہا ہے۔ اس لیے اس نے اب دھڑا دھڑ عرضیاں دینا شروع کردیں جس نوکری کا اشتہار اخبار میں نکلتا، بپن اس کے لیے عرضی دے دیتا۔ وہ غور نہ کرتا کہ نوکری کے لیے کیا قابلیت اور کیا تجربہ ضروری ہے۔ اُس کی کیا شرائط ہیں۔ وہ بس نوکری دیکھتا اور عرضی بھیج دیتا۔ اُسے ایک دھندلا سا غیر منطقی اور تقریباً توہمانہ یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن نوکری کے لیے اُسے ضرور بلا لیا جائے گا۔ اس لیے ہارتے ہوئے جواری کی طرح جو ہر داؤ پر رقم لگاتا چلتا ہے، بپن نوکریوں کے لیے درخواست بھیجتا رہا۔

لیکن پہلا مہینہ گزر گیا۔ دوسرا مہینہ گزر گیا۔ تیسرا مہینہ گزر گیا۔ بھیجی گئی درخواستوں کی تعداد چالیس سے ساٹھ اور ساٹھ سے سو ہو گئی۔ لیکن تقرری کا پروانہ کہیں سے نہ آیا۔ بیشتر جگہوں سے تو رسید بھی نہ آئی بپن کی تقدیر اس سے روٹھ گئی تھی۔ خوش نصیبی کا دھارا بھاٹے کا شکار ہو کر اس کی زندگی کے کنارے سے دور بہت دور چلا گیا۔ اس لیے اب توہم پسندی کی جگہ تنقیدی شعور نے جگہ لینا شروع کر دی اُس نے حقیقت کو دیکھنا شروع کیا " میں کیوں امید کرتا ہوں کہ مجھے نوکری مل جائے گی؟ مجھے کیوں یقین ہے کہ میں پھر کھوئی ہوئی نوکری پا جاؤں گا؟ یہ اتفاق تھا کہ مجھے عوضی نوکری مل گئی تھی لیکن اتفاق بار بار نہیں آتے۔ میرے پاس کونسی غیر معمولی ڈگری، کون سا تجربہ ہے جو مجھے نوکری مل جائے گی۔ میں سادہ بی۔ اے ہوں کوئی ٹیکنیکل علم یا تجربہ مجھے نہیں۔ پھر بھی میں کیوں اُس آس کے دھند میں بھٹک رہا ہوں کہ نوکری ملے گی مجھے نوکری نہیں ملے گی۔ مجھے اجیت کو سب کچھ بتا دینا چاہیے۔"

بپن نے اجیت کو سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنے کمرے سے اٹھ کر

اجیت کو بتانے کے لیے دوسرے کمرے کی طرف جانے لگا۔ لیکن جاتے جاتے نہ جانے کیوں اسے خیال آیا کیوں ایک آخری کوشش اور نہ کر لی جائے۔ جہاں اتنے دن انتظار کیا ہے، دو چار ہفتے اور انتظار کر لیا جائے۔ ہو سکتا ہے تقدیر جاگ جائے معجزہ واقع ہو جائے۔ اجیت کے سامنے وہ اعتراف گناہ کرنے کی ندامت سے بچ جائے۔ اور وہ لوٹ آیا۔ اس نے اخبار پلٹا۔ اُس دن صرف ایک ہی اچھی نوکری کا اشتہار تھا۔ بپن نے اُس کے لیے درخواست دے دی۔ کیونکہ اُس نوکری کے لیے اس کے پاس کوئی ٹھوس ڈگری یا تجربہ نہ تھا، اس لیے عرضی ختم کرتے کرتے اس نے یوں ہی لکھ دیا "آخر میں میں عرض کرنا چاہوں گا کہ مجھے مشہور مغنیہ اجیت کا شوہر ہونے کا شرف حاصل ہے۔"

بپن نے عرضی ڈال دی۔ ہفتہ گزر گیا، دو ہفتے گزر گئے۔ مہینہ بھی گزر گیا اور بپن کی آخری امید نے بھی دم توڑ دیا اب اعتراف اقرار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اب اجیت کو سب کچھ بتا دینا ہوگا معجزوں میں یقین رکھنا حماقت ہے۔

لیکن اسی دن جب اس کا معجزوں سے یقین اٹھ گیا اور وہ اجیت کو سب کچھ بتانے والا تھا، ایک بار پھر معجزہ ہو گیا۔ خلاف توقع بپن کو انٹرویو کے لیے بلا لیا گیا اور اُس سے صرف اس بات کی تصدیق کرنے کے بعد کہ وہ واقعی مغنیہ اجیت کا شوہر ہے اس کے ہاتھ میں تقرری کا پروانہ دے دیا گیا تھا۔

———•••———
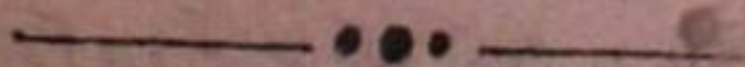
نجات

نیلے مکان والی کا نام تو چمپو تھا، مگر سب اسے تھانے دارنی کہہ کر پکارتے تھے، کیوں کہ وہ تھانے دار بشمبر داس کی بیوی تھی۔ ویسے وہ خود بھی ڈیل ڈول میں کسی تھانے دار سے کم نہ تھی۔ اس کے چہرے سے رعب اور دبدبہ ٹپکتا تھا۔ اس کی گرجتی اور کڑکتی ہوئی آواز سن کر محلّے والوں کے دل دہل جاتے۔ محلّے میں کھیلتے ہوئے لڑکے اور لڑکیاں اسے دیکھ کر ایک طرف رکُ جاتے، سر جوڑ کر باتیں کرتی ہوئی عورتیں ایک دم یوں چپ سادھ لیتیں جیسے انھیں کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔

تھانے دارنی کا یہ رعب اور دبدبہ کوئی مصنوعی چیز نہ تھی، بلکہ ایک ٹھوس حقیقت تھی ایک دو بار محلّے کی تیز طرار عورتیں اس سے الجھ کر اس کی بے پناہ طاقت اور زبان درازی کا مزا چکھ بھی چکی تھیں۔ اب تو ہر کوئی اس کی خوشامد کے لیے کمر بستہ تھا، کیوں کہ جس کسی کا وہ ساتھ دیتی اسی کا پلہ بھاری ہو جاتا، جس کی مخالفت کا وہ فیصلہ کر لیتی وہ مقابلہ کیے بغیر میدان سے بھاگ نکلتا۔ اسی رعب اور دبدبہ کا نتیجہ تھا کہ تھانے دارنی ہر وقت اپنی بہادری، چالاکی، ہمت اور ہوشیاری کے قصّے سُناتی رہتی، اور محلّے والیاں شردھا اور عقیدت سے بت بنی اس کی داستانیں سنتی رہتیں۔ کبھی کسی میں جرأت نہ ہوتی کہ اس کی بات کاٹ سکے

یا اسے غلط قرار دے سکے۔ کسی پر کوئی مصیبت پڑتی تو وہ تھانے دارنی کے پاس ضرور آتا۔ وہ اور کچھ نہیں تو ہمدردی ہی جتا دیتی ۔ حاضری نہ دینے کا خمیازہ مصیبت زدہ کے لیے بڑا سخت تھا۔ اس کا وہ مذاق اڑاتا کرتو بہ ہی بھلی۔

پچھلے برس محلے میں ایک نیا نیا کنبہ آیا۔ بدقسمتی سے اس کنبے کے افراد کے ساتھ لگاتار دو حادثے ہو گئے۔ پہلی بار تو بڑی بہو کا نکلس کسی نے میلے میں اتار لیا اور دوسری بار ان کے گھر میں چوری ہو گئی، لیکن وہ کنبہ تھانے دارنی کے حضور میں حاضر نہ ہوا اور اس نے زیادہ نہ کی، اس لیے ہمدردی کی بجائے تھانے دارنی کے غیض و غضب کا شکار ہوا۔ وہ صبح و شام اس کنبے کی حماقت اور غفلت کا مذاق اڑاتی رہتی جنھوں نے جاگتے میں ہار اڑوا دیا اور سوتے میں چوری کرالی۔ اس کنبے کو مکان تو چھوڑنا ہی تھا، لیکن تھانے دارنی کی فقرہ بازی اور ستم شعاری سے وہ کل کے جاتے آج ہی مکان چھوڑ کر چلے گئے۔

اس کنبے نے تو خیر مکان تبدیل کر کے تھانے دارنی کے طعنوں سے نجات پائی، مگر کرشنا کی ماں کیا کرتی۔ جس دن سے اس نے شہد والے سے شہد کی بجائے گڑ کی چاشنی لے لی تھی، اس کی جان مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ تھانے دارنی جہاں کہیں کرشنا کی ماں کو دیکھتی۔ بلا تکلف کوئی نہ کوئی ایسا فقرہ کس دیتی :

"کیوں جی اور کس کس سے بڑی سیٹھانی جی نے شہد خریدا ہے ؟"

"کیا شہد والا بہت میٹھا تھا ؟"

"اس عمر میں بھی صورت دیکھ کر شہد اور چاشنی کا فرق بھول جاتا ہے۔"

تھانے دارنی کی طرح اور عورتیں بھی کرشنا کی ماں سے مذاق کرتے ہوئے نہ چوکتیں۔ اور کرشنا کی ماں جو کسی زمانے میں تھانے دارنی کے برابر کی چوٹ تھی، تھانے دارنی کے ڈھنڈورے سے بہت گھبرا گئی۔ بے چاری کا جینا دو بھر ہو گیا۔

سارا دن گھر میں گھسی رہتی۔ بہت مجبوری کی حالت میں وہ چوروں کی طرح دن چڑھنے سے پہلے یا شام ڈھلنے کے بعد گھر سے نکلتی ۔ ٹھانے دارنی کو دیکھ کر اس کے ہوش اُڑ جاتے۔ اس آفت سے جان چھڑانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ کیوں کہ محلے میں اس کا اپنا مکان تھا۔ کوئی زمانہ تھا کہ اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ لیکن اب تو اس پر قفل لگ گیا تھا۔

نہ جانے یہ سلسلہ کب تک جاری رہتا۔ مگر ایک دن جب کرشنا کی ماں نے سنا تھا کہ ٹھانے دار بتمبر داس کی تبدیلی ہو گئی ہے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سر سے کوئی بلا ٹل گئی ہو۔ مگر یہ لمحاتی خوشی کا محل جلد ہی مسمار ہو گیا۔ اگلے ہی دن اس نے ٹھانے دار کی تبدیلی کے منسوخ ہونے کی خبر سنی۔ اس کی آنکھوں میں مسکرانے والی روشنی پھر اندھیرے میں بدل گئی۔ ایک بار پھر زندگی نے اسے گھر کی چاردیواری میں مقید رہنے کا حکم دے دیا۔ اس کی زبان جو کچھ کہنے کے لیے بے تاب تھی پھر مقفل ہو گئی۔ ایک بار پھر وہ اس شبھ گھڑی کا انتظار کرنے لگی۔ جب وہ اس بلا سے چھٹکارہ پا سکے گی۔

آخر ایک رات کرشنا اپنی ادھ مری ماں کے لیے زندگی کا پیام لے آئی۔

"ماں — وہ ٹھانے دارنی ہے نا ٹھانے دارنی، جو اپنے آپ کو بہت چالاک اور ہوشیار سمجھتی ہے۔ آج وہ بھی لٹ گئی؟"

"کیسے؟" کرشنا کی ماں کی آنکھوں میں روشنی کوند گئی۔

"ٹھانے دار بتمبر داس اور ٹھانے دارنی نے صبح ایک بھینس کا سودا کیا تھا۔ بھینس والا ساڑھے پانچ سو مانگتا تھا۔ مگر ٹھانے دارنی سوا پانچ سو دیتی تھی اس لیے صبح تو وہ سودا نہ ہو سکا۔"

"پھر کیا ہوا بیٹا؟"

"جب تھانے دار بشمبر داس تھانے گئے تو کوئی آدمی دودھ سے بھری ہوئی پیتل کی نئی بالٹی لے کر آیا۔ بولا۔ تھانے دار صاحب نے بھینس کا دودھ نکلوا کر دیکھا ہے اس نے بارہ سیر دودھ دیا ہے۔ یہ رکھ لو اور سوا پانچ سو روپے دے دو۔"

تھانے دارنی نے پوچھا" اور بھینس کہاں ہے؟"

اس آدمی نے جواب دیا" تھانے میں بندھی ہوئی ہے۔ کانسٹبل لاتا ہوگا۔ آپ جگہ وغیرہ صاف کرالیں"۔

تھانے دارنی نے سوا پانچ سو روپے اس آدمی کو دے دیے اور بھینس کا انتظار کرنے لگی۔ مگر بھینس کہاں آتی تھی۔ کوئی تھانے دارنی کو جُل دے گیا تھا۔"

یہ سنتے ہی کرشنا کی ماں کے مردہ چہرہ پر زندگی عود کر آئی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے برسوں کی قید سے نجات مل گئی ہو۔ اس مکتی کا مکمل لُطف لینے کے لیے وہ گھر سے نکل کھڑی ہوئی تاکہ محلہ والوں کو چٹخارے لے لے کر یہ مزے دار واقعہ سُنا سکے۔

اعتبار کی قیمت

لالہ رادھا کشن کو ڈاک خانہ سے ریٹائر ہونے کے سلسلہ میں اس بات کی بے حد خوشی ہوئی کہ وہ اتنی طویل نوکری کے بعد بغیر لال سیاہی کے اندراج کے ریٹائر ہو رہے تھے۔ ان کے محکمہ سے اس صورت ریٹائر ہونا واقعی فخر کی بات تھی، کیوں کہ آئے دن ڈاک خانہ کے ملازموں کے خلاف ضابطے کی کارروائیاں چلتی تھیں۔ کہیں چیزوں کے گم ہونے کے جھگڑے ہوتے، کہیں غبن کا سلسلہ ہوتا، کہیں منی آرڈروں کے قضیے۔ ان حالات میں لالہ جی اپنی صاف نوکری پر نازاں کیوں نہ ہوتے۔ جب دفتر والوں نے انھیں الوداعی دعوت دی تو لالہ جی اس بات کا ذکر کرتے رہے کہ ان کے چھتیس سال کی نوکری کے ریکارڈ میں ایک لال سیاہی کی اینٹری نہیں، جب کہ ان کے ساتھیوں کے ریکارڈ میں چھ چھ سات سات لال سیاہی کے اندراج ہو چکے تھے۔ یہ بات کہتے کہتے ان کی گردن فخر سے پھول گئی تھی، چہرے پر سرخی نمودار ہو گئی تھی۔

اور لالہ جی کے خیال میں ان کا اس طرح ریٹائر ہونا ایک ایسا کارنامہ تھا جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی تھی۔ اس فخر کا موجب لالہ جی کی وہ عادت تھی جو انھوں نے اپنے والد محترم سے ورثہ میں لی تھی۔ لالہ جی کے پتا جی بہت کامیاب بیوپاری تھے۔ ان کی کامیابی کا راز تھا کہ انھوں نے زندگی بھر کسی دوسرے پر یقین نہ

گیا تھا۔ نہ کسی کے بھروسے اور آسرے پر اپنی زندگی کی گاڑی چلائی تھی، یہاں تک کہ اپنے بچوں کو بھی اس سلسلے میں نہیں چھوڑا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہے تجارت کرتے رہے۔ ہر کام اپنی نگرانی میں کرواتے رہے۔ ان کے لیے آرام حرام ہی نہیں تھا بلکہ موت کا پیغام تھا۔

اور جب رادھاکشن نے ڈاک خانے کی نوکری کی تو انھوں نے باپ کی اسی عادت کو اپنائے رکھا۔ وہ دفتر کے فرائض سے کسی صورت کوتاہی نہ کرتے۔ نہ کسی کو اپنا کام کرنے کے لیے کہتے۔ یہی وطیرہ ان کے گھر کے کام کاج کے سلسلہ میں تھا۔ انھوں نے آج تک دودھ سبزی والے کا اعتبار نہ کیا تھا۔ ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے دودھ نکلوا کر لاتے۔ سبزی تازہ ٹوکروں سے خریدتے۔ گھر میں گندم صاف ہوتی تو آٹا پسواتے۔ گھی کے لیے تازہ کریم نکلوا کر لاتے۔ غرضیکہ وہ ہر کام سوچ بچار سے پایہ تکمیل کو پہنچاتے۔ اسی چیز کو وہ نبھاتے نبھاتے وہ کلرک سے انچارج ہوئے اور انچارج سے سب پوسٹ ماسٹر اور سب پوسٹ ماسٹر سے پوسٹ ماسٹر۔ ڈاک خانہ کے کام کی نگرانی وہ دوسرے پر نہ چھوڑتے۔ خود اپنے سامنے بیٹھ کی چھیاں مُہر بند کروا دیتے۔ نقدی خود گن کر خزانے میں بھیجتے۔

یہ لالہ جی کی محنت کا نتیجہ تھا کہ ڈاک خانے کے بڑے بڑے افسر اُن کی تعریف کرتے تھے۔ جو ڈاک خانہ ذرا گڑبڑ سے چلتا لالہ جی کو وہاں بھیج دیا جاتا۔ چند دنوں میں ہی گاڑی ٹھیک طریقے سے چلنے لگتی۔ لالہ جی جلد ہی دفتر چلے آتے اور وہاں سے دیر سے لوٹتے۔ ادھر گھر کی ذمہ داریاں بھی کچھ زیادہ نہ تھیں اس لیے ان کی عدم توجہ سے اسے کوئی خاص نقصان نہ پہنچا تھا۔ زیادہ وقت وہ دفتر میں ہی گزارتے دفتر کے علاوہ ان کے کوئی اور مشاغل بھی نہ تھے۔ اس لیے ان کی زندگی ایک ہی محور کے گرد گھوم رہی تھی۔

ان کی ایک بیٹی تھی جس نے بی اے۔ بی ٹی کر کے اسکول کی نوکری کر لی تھی۔ تھوڑے عرصے کے بعد لالہ جی نے اس کی شادی بھی کسی اچھے گھرانے میں کر دی تھی۔ لڑکی کے جانے کے بعد جب ذرا گھر میں اداسی ہوئی تو لالہ جی نے داماد اور لڑکی کو گھر پر ہی رکھ لیا تھا۔ لالہ جی کی زندگی ہر طرح کی پریشانیوں سے بچی ہوئی تھی، اس لیے وہ امن چین سے دن گزارتے تھے۔ لیکن مشغولیت سے کبھی دامن چھڑانے کا خیال بھی ان کے ذہن میں نہ آیا۔

اور ریٹائر ہونے کے بعد تو انھیں اس طرح محسوس ہونے لگا جیسے انھیں بالکل فرصت مل گئی ہو۔ لیکن اس احساس کو انھوں نے زیادہ دیر زندہ نہ رہنے دیا۔ دفتر کے بجائے وہ گھر کے کام دھندوں میں لگ گئے۔ صبح سیر کو جاتے۔ دودھ سبزی اور دوسرا سودا سلف لانے کے سلسلے میں کئی دوکانوں سے پوچھ تاچھ کرتے جہاں مال سستا اور اچھا ہوتا وہیں سے خریدتے۔ گھر میں ہوتے تو نواسوں کو پڑھاتے کبھی کبھار گھڑی دو گھڑی سو بھی جاتے۔ لیکن وقت تھا کہ پھر بھی بچ جاتا۔

اور شاید وہ اسی ڈھنگ سے زندگی گزار دیتے اگر ان کا خرچ ان کی آمدنی سے نہ بڑھ جاتا۔ سو روپے پنشن میں کہاں گزر ہوتی۔ اس لیے جمع کیے ہوئے اثاثے سے کھانا تو وہ بالکل معیوب سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اپنی آمدنی بڑھانے کی سوچی۔ دلّی میں مکانوں کی سخت قلت تھی۔ معمولی سے معمولی دو کمروں کا مکان بھی سوا سو روپے سے کم کرایے پر نہ اٹھتا تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے ایک منزلہ مکان کو دو منزلہ بنا دیا۔ مکان کی اوپر والی منزل میں وہ خود چلے گئے اور نچلی منزل انھوں نے کرایے پر اٹھا دی۔

اور پھر آمدنی کے بڑھنے سے لالہ جی کے کھانے پینے کے شوق بدلے۔ کچھ سیر و سیاحت کا خیال بھی انھیں ستانے لگا۔ اور جب انھوں نے ہردوار جانے کا فیصلہ کیا

تو ان کی پتنی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ پچھلے تیس سال سے ہردوار ہردوار جپتی آئی تھی لیکن اس کے پتی نے کبھی اس طرف توجہ ہی نہ دی تھی۔ بالآخر اس نے تنگ آکر کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس دن بھگوان نے اس کی آشا پر تکمیل کے پھول چڑھا دیے تھے۔ اور پھر میاں بیوی بچہ بیٹی اور نواسوں کے ہردوار چلے گئے۔ لالہ جی کا داماد چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے اُن کے ساتھ نہ جا سکا۔ وہ ہردوار میں گرڈوری کی دھرم شالہ میں ٹھیرے۔ وہیں لالہ جی کے پریوار کی ملاقات دلّی کے پروفیسر بمل سے ہو گئی۔ پروفیسر بمل لالہ جی کے کنبے سے چند دنوں میں اس قدر گھل مل گئے جیسے ان کی کئی برسوں کی شناسائی ہو۔ پروفیسر صاحب لالہ جی کو باپ سمجھتے تھے اور ان کی پتنی کو ماں کہتے تھے۔ ان کی بیٹی اور بچوں کو بھی بے حد عزیز جانتے۔ اتنی محبت کرنے پر بھی لالہ جی نے پروفیسر صاحب کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اُسے محض ایک معمولی مسافر سمجھتے تھے جو انھیں سفر میں ملا ہو۔ اور یہ ملاقات لمحاتی درجے سے بڑھ کر کوئی اہمیت نہ حاصل کر پائی۔

اور شاید یہ لمحاتی ملاقات لمحاتی ہی رہتی اگر پروفیسر صاحب کا خلوص اور ضد اسے مستقل بنانے پر نہ تلے ہوتے۔ دلّی میں پہنچ کر ہر دوسرے چوتھے کی ملاقات اس سلسلہ میں اہم کڑیاں تھیں۔ لالہ جی کے نہ چاہنے پر بھی یہ میل جول بڑھنے لگا۔ پروفیسر بمل جب لالہ جی کے ہاں آتے۔ بچوں کے لیے پھل یا مٹھائی ضرور لے آتے۔ اور پھر پہروں ان سے باتیں کرتا رہتا۔ لالہ جی ہوںہہ ہاں کرتے رہتے۔ لیکن پروفیسر بمل مایوس نہ ہوتے لالہ جی بیشک اس کی جانب دھیان نہ دیتے لیکن ان کی بیوی اور بیٹی تو اسے بہت اچھا سمجھتیں۔ اور یہ ان کی خاص توجہ کا نتیجہ تھا کہ لالہ جی بھی پروفیسر بمل کی جانب جھک گئے۔ مہینے میں وہ اگر دو چار دفعہ نہ آتا تو وہ اس کی جواب طلبی کرنے لگتے۔

اور جب پروفیسر بمل کو مکان کی ضرورت پڑی تو لالہ جی نے بغیر حیل و حجت کے دوسری منزل کی برساتی اس کے لیے خالی کروادی۔ اب تو پروفیسر بمل لالہ جی کے گھر میں ہی رہنے لگا۔ وہ دلی میں لڑکیوں کے کالج میں پڑھاتا تھا۔ کئی بار تو وہ اس پرائیویٹ کالج کی لڑکیوں کی فیس بھی گھر لے آتا اور لالہ جی کو سنبھالنے کے لیے سونپ دیتا۔ ایک بار وہ بہت سے گہنے بھی لے آیا۔ وہ بھی لالہ جی نے لوہے کے سیف میں رکھ لیے کئی بار پروفیسر یہ پیسے لے جاتا، کئی بار جمع کروا دیتا، کبھی وہ کوئی گہنا لے جاتا اور پھر جمع کروا دیتا۔ لالہ جی گھر پر نہ ہوتے تو ان کی پتنی یا شیلا ہی یہ کام سرانجام دے دیتی۔ اس میں خدشے کی کوئی بات نہ تھی کیونکہ یہ مال پروفیسر بمل کا تھا۔ پروفیسر بمل کے سلوک اور بے غرض خدمت کے جذبے نے لالہ جی کے من کو موہ لیا۔ وہ کہے، بغیر کہے لالہ جی کے کاموں کو پورا کرنے کے لیے کمربستہ رہتا۔ جیسے وہ لالہ جی کا زر خرید غلام ہو۔ لالہ جی اسے جو کام بھی کہتے جو بات بھی کہتے وہ دھیان سے اسے سرانجام دیتا۔

اور پھر اسی ڈھنگ سے دن گزرتے رہے۔ پروفیسر بمل لالہ جی کے کنبے کا ایک فرد بن گیا تھا۔ وہ کئی بار لالہ جی کے ہاں ہی کھانا کھا لیتا۔ لالہ جی نے بھی اس کی محبت اور خلوص کو ٹھکرایا نہ تھا۔ وہ بھی اس سے ہر بات میں مشورہ کرتے۔ اس کی تجویز پر مکمل دھیان دیتے۔ پچھلے دنوں ایک کرایہ دار کے نکالنے کا جھگڑا تھا۔ پروفیسر بمل نے کچہری کی بجائے گھر میں ہی فیصلہ کروا دیا تھا۔ کرایہ دار نہ صرف پچھلے مہینوں کا کرایہ دے گیا تھا بلکہ لالہ جی کو اس مہینے کی رقم بھی دے گیا تھا۔ لالہ جی اس کارنامہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ پروفیسر بمل کو ایک بہت بلند انسان سمجھنے لگے تھے۔ آج انھیں زندگی میں پہلی بار خیال آیا تھا کہ دنیا میں سب لوگ برے نہیں اچھے لوگ بھی ہیں جن پر یقین اور بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی زندگی بھر کی بدگمانی دور ہو گئی۔ اعتماد اور یقین کی ایک ننھی سی لو ان کے سینے میں جھلملانے لگی۔

کچھ دن بعد لالہ جی نے ایک مکان خریدنے کی تجویز بنائی۔ کرشن نگر میں ایک مکان ان کو پسند بھی آ گیا۔ لیکن اس بار بھی پروفیسر بمل نے ان کو اپنی نیک رائے سے بچایا " لالہ جی کرشن نگر میں بھول کر مکان نہ لیجیے گا "

" کیوں ؟ لالہ جی نے پوچھا۔

" وہاں ہر برس جمنا کا پانی چڑھ آتا ہے مکانوں کو دیمک لگ جاتی ہے۔ ان کی قیمت آدھی رہ جاتی ہے "

" تو پھر کہاں دوسرا مکان بنایا جائے ؟ قرول باغ میں تو زمین کے بھاؤ دُگنے چوگنے ہو گئے ہیں "

" اجی نہیں۔ میرے ایک دوست کے پاس قرول باغ میں ایک پلاٹ ہے۔ وہ میں آپ کو سستا دلوا دوں گا "

" کتنے میں مل جائے گا ؟ " لالہ جی نے پوچھا۔

" بارہ ہزار مانگتا ہے۔ دس ہزار میں فیصلہ کرا دوں گا۔ ایسا پلاٹ آپ کو ملتا نہیں "

اگلے دن پروفیسر بمل لالہ جی کو مکان کا پلاٹ دکھا لائے۔ پلاٹ واقعی لاجواب تھا۔ لالہ جی لٹو ہو گئے۔ بات طے ہو گئی۔ پلاٹ کے مالک نے سودا پکا کرنے کے لیے چار ہزار بطور بیعانہ مانگے۔ لالہ جی نے اگلے دن بینک سے چار ہزار روپے نکلوا کر پروفیسر بمل کے ہاتھ بھجوا دیے۔ دو گھنٹے بعد پروفیسر بمل نے ان کو رسید لا کر دے دی۔ سودا پکا ہو گیا۔ رجسٹری کی تاریخ اگلے سوموار کے لیے طے ہو گئی۔

لالہ جی روپے کا انتظام کرنے میں لگ گئے۔ ان کا کافی روپیہ ادھار پر تھا۔ دوڑ دھوپ کر کے اتوار تک وہ روپیہ جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے تب انھیں یکایک خیال آیا کہ ان دنوں وہ پروفیسر بمل سے ایک بار بھی

نہیں ملے۔ مگر ان کی بیوی نے بتایا کہ ان کے پیچھے دو بار آئے تھے۔ ایک بار اپنا زیور لینے اور دوسری بار رکھنے۔ دونوں بار ہی لالہ جی باہر گئے ہوئے تھے۔

لالہ جی کو افسوس سا ہوا۔ دراصل وہ اب پروفیسر بمل سے محبت کرنے لگے تھے۔ ان سے ملے بنا انھیں چین نہ پڑتا تھا۔ وہ تو رات ہی کو پروفیسر بمل سے مل آتے، لیکن ایک تو دیر ہو گئی تھی، دوسرے اگلی صبح انھیں رجسٹری کرانے کے لیے آنا ہی تھا۔

سوموار کی صبح ہوئی اور وہ نہا دھو کر اور روپے تھیلی میں ڈال کر پروفیسر بمل کے آنے کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ نو بجے، دس بجے، گیارہ بج گئے .....
اب لالہ جی کو بے چینی ہوئی۔ پھر انھیں خیال ہوا کہ شاید وہ اپنے دوست کے ہاں ان کا انتظار کر رہے ہوں۔

روپے لے کر وہ ان کے دوست کے ہاں پہنچے۔ پروفیسر بمل وہاں بھی نہ پہنچے تھے۔ جب لالہ جی نے رجسٹری کی بات کی تو پروفیسر بمل کا دوست حیران رہ گیا "آپ رجسٹری کی بات کر رہے ہیں؟ پر آپ نے چار ہزار پیشگی کے کہاں بھجوائے تھے؟"

"کیا؟" لالہ جی جیسے پہاڑ سے گر پڑے "میں نے تو پروفیسر بمل کے ہاتھ روپے بھجوائے تھے۔ یہ رہی آپ کی رسید"
لالہ جی نے رسید دکھائی۔ لیکن بمل کے دوست نے رسید لوٹا کر کہا "پھر لالہ جی آپ ٹھگے گئے۔ نہ یہ رسید میری ہے۔ نہ پروفیسر بمل میرے پاس آئے ہیں۔ میں خود تین دن سے ان کی تلاش میں ہوں۔"

اور گھر جا کر جب لالہ جی نے ان زیوروں کو دیکھا جو پروفیسر بمل رکھ گئے تھے تو

انھیں معلوم ہوا وہ سونے کے نہیں ہیں۔ پروفیسر بمل اصلی لے کر نقلی زیور رکھ گئے تھے۔

اب انھیں شبہ نہ رہا۔ پروفیسر بمل نے انھیں ٹھگ لیا اور صرف اس لیے کہ انھوں نے پہلی بار کسی آدمی پر اعتماد کر کے اُس اصول کو توڑا تھا۔ جس پر وہ زندگی بھر عمل کرتے رہے تھے اور جو انسان کی فطرت کے بارے میں ان کا آخری فیصلہ تھا۔

———— •• ————

کرشنا اپنی سمجھ اور عقل مندی کی بدولت گھر ہی میں نہیں، سارے محلے میں مشہور تھی۔ اتنا بڑا کنبہ اور اتنی قلیل آمدنی، یہ اس کا ہی بھیجا تھا کہ زندگی کے دن چین سے گزر رہے تھے۔ وہ روکھی سوکھی کھا کر بھی گزر کر لیتی۔ لیکن لباس میں وہ کسی سے کم نہ رہتی جب گھر کی چار دیواری سے باہر نکلتی تو اس کی سج دھج سے یہ محسوس ہوتا کہ اس کے خاوند کی تنخواہ پانچ سو روپے ہے۔

گھر کو سجائے بنائے رکھنے کا اسے بے حد شوق تھا۔ اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹ کر اس نے ریڈیو خریدا تھا، صوفہ سیٹ لیا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کو حسین رنگ برنگے پردوں سے مزین کیا تھا۔ اس کا رہن سہن دیکھ کر سب حیران رہ جاتے تھے کہ اس نے اتنا کچھ سامان کیسے جوڑ لیا ہے، اور کس کے بل بوتے پر یہ سارے ٹھاٹ باٹ ہو رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ کرشنا کے میکے والے بے حد امیر ہیں اور اس کا بھائی انکم ٹیکس کے محکمے کا بڑا افسر ہے اور یہ سب ان کی وجہ سے ہے۔ کسی کا خیال تھا کہ کرشنا کا دیور میونسپل کمیٹی میں چونگی کا انسپکٹر ہے اور یہ سب اس کی لائی ہوئی رشوت کا چمتکار ہے۔

مگر یہ سب باتیں جھوٹ تھیں۔ کرشنا کو نہ اس کے ماں باپ کچھ بھیجتے تھے، نہ اس کا بھائی دے جاتا تھا، اور نہ یہ سب اس کے دیور کا عطیہ تھا۔ یہ تو اس کی اپنی

خوش سلیقگی اور کفایت شعاری کی جلوہ گری تھی۔ اس نے زندگی بھر اس اصول کو اپنائے رکھا تھا کہ خرچ آمدنی سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس اصول سے ایک انچ ادھر ادھر ہونا اس کی شریعت میں روا نہ تھا۔ وہ کوڑی کوڑی کی فکر کرتی، اس لیے روپے اپنی فکر خود کر لیتے۔ وہ صبح کے کھانے کے لیے سبزی صبح کے مہنگے بھاؤ نہ لیتی بلکہ رات کو خرید لاتی، ایک تو سستے داموں مل جاتی۔ دوسرے صبح سویرے کی دوڑ دھوپ سے چھٹکارا مل جاتا۔ فیشن کا کپڑا تا وہ اس وقت لیتی جب اس کا بھاؤ گر جاتا اور چیز کی اچھائی یا برائی کی پرکھ بھی ہو جاتی۔ گھر کا سارا کام وہ خود ہی کرتی۔ فضول پیسے مہری کو نہ دیتی ایک دو بار اس کے پتی نے مہری رکھی بھی، لیکن اگلے ہی دن اس نے مہری کو کسی نہ کسی بہانے چھٹی دے ڈالی۔ اس کے بڑے لڑکے کا پاجامہ پھٹ جاتا تو وہ چھوٹے کا پاجامہ بنا دیتی تھی۔ قمیص پھٹتی تو ان سے رومال بننے لگتے پرانی پتلونوں کے تھیلے سل جاتے۔ اگر گھر گرہستی اس کے پتی لاجپت کو چلانی پڑتی تو گاڑی ذرا آگے نہ چل سکتی۔

کرشنا محض اپنے گھر کی گاڑی چلانے ہی میں ماہر نہ تھی۔ بلکہ اڑوس پڑوس میں بھی وہ سب کے کام آتی رہتی۔ وہ سب سے میل ملاپ رکھتی۔ سب کے دکھ سکھ میں شریک رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ اڑوس پڑوس والے اسے بے حد اچھا سمجھتے اور اس سے محبت کرتے۔

مگر پچھلے تین مہینوں سے اس کے سامنے مکان میں ایک نیا کنبہ آ گیا تھا جس کے بچے کنونٹ اسکول میں پڑھتے تھے۔ بچوں کی ماں پٹنا ایک اپ ٹو ڈیٹ، جاذب نظر عورت تھی۔ جو ہر وقت بنی سنوری رہتی۔ اس کے تن پر نئے نئے فیشن کے کپڑے ہوتے گلے میں نئے نئے گہنے ہوتے۔ دن میں تین تین بار کپڑے بدلتی۔ اس کا شوہر بھی نئے سے نئے سوٹ پہنے ہر وقت براتیوں کی طرح ٹھاٹ باٹ سے رہتا۔ اسکوٹر پر اڑا اڑا

پھرتا۔ پشپا کا لڑکا سنیل اور لڑکی نیرا اپنی ممی کی طرح بجے سنورے رہتے۔ ان کے لباس چمکتے۔ جب وہ باتیں کرتے تو ان کے موہنہ سے پھول جھڑتے۔ ان کے مکان میں سارا دن رونق رہتی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ پشپا ایک بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ دوسروں کا خیال تھا کہ اس کا پتی ہری چند ایک ایسے محکمہ سے منسلک ہے جس سے بڑے بڑے بیوپاریوں کا واسطہ پڑتا ہے۔ یہ عیش ہری چند کی تنخواہ کا کرشمہ نہیں، بالائی آمدنی کا معجزہ ہے۔ اس مکان میں پہنچتے ہی پشپا نے اپنے لڑکے سنیل کا جنم دن منایا۔ اس دن گھر میں وہ رونق رہی کہ اس کی نظیر ملنی مشکل تھی۔ سنیل کے ماما، مامی، چچا چاچی، خالہ خالو وغیرہ وغیرہ سب آئے اور اسے بڑے بڑے تحفے دیے گئے۔ ان میں ٹرانزسسٹر بھی تھا اور کیرم بورڈ بھی، کرکٹ کھیلنے کا سامان بھی ان میں گھڑی بھی تھی اور نقد روپے بھی۔ سنیل مہمانوں میں بیٹھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی فرشتہ آسمان سے اُتر کر آگیا ہو — اور اس کے ارد گرد دنیا کی ہر چیز رکھ دی گئی ہو۔ مہمانوں نے تحفے دیے۔ چائے پی، گپ شپ ہانکی اور پھر اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

پشپا کی نقل میں بشمبر ناتھ کی بیوی شیلا نے بھی اپنے بچے سدھیر کا جنم دن منایا۔ اس میں سنیل کے جنم دن کا ساٹھاٹ باٹ، سج دھج، شور اور غوغا تو نہ تھا، لیکن پھر بھی محفل اچھی جمی۔ لوگ سدھیر کے لیے اچھے اچھے تحفے لائے۔ ان میں نئے نئے کھلونے تھے۔

سنیل اور سدھیر کے جنم دن تو بیت گئے، مگر کرشنا کے سینے میں ایک نیا چاؤ، نئی امنگ، نئی آرزو چھوڑ گئے۔ اس کا دل بھی چاہا کہ اپنے لخت جگر کا جنم دن منائے، اس ڈھب سے سب کو دعوت دے کھلائے پلائے اور ان سے تحفے وصول کرے۔ یہ تمنا اس کے دل اور دماغ پر بُری طرح سوار ہو گئی تھی۔ اب وہ کفایت شعار بیوی نہ رہی تھی۔ بلکہ ایک لاڈلے کی ماں کے روپ میں جلوہ افروز تھی۔ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے اپنی چال کو بھی چھوڑنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ شام کو جب اس کا پتی دفتر سے لوٹا تو اس نے

کہا "دیکھوجی، مجھے اب کے ہریش کی سال گرہ ضرور منانی ہے اب کے میں اپنا ارمان پورا کرکے رہوں گی۔"

ایک منٹ کے لیے اس کا پتی حیران سا رہ گیا" تو اس فضول خرچی پر اُتر آئی ہے۔ آج کیا ہو گیا ہے تجھے؟"

"مجھے کچھ نہیں ہوا" کرشنا نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا، یہ تنگی تو زندگی بھر رہے گی۔ ایک دن تو اپنے لاڈلے کا ارمان چاؤ پورا کرلوں۔"

"اچھا تو پھر تیری مرضی" کرشنا کے پتی نے اپنی رضامندی دے دی۔

کرشنا زور شور سے تیاریوں میں لگ گئی۔ وہ باری باری سب رشتہ داروں کے ہاں گئی۔ سب کو اس نے اپنے بچّے کی سال گرہ پر آنے کی دعوت دی۔ اس نے معمولی جان پہچان کے لوگوں کو بھی مدعو کیا۔ سال گرہ سے ایک دن پہلے اس نے پھر سب کو دعوت کی یاد دہانی کرائی۔ سارے گھر کی صفائی کی۔ چیزوں کو سلیقے اور قرینے سے لگایا۔ بچّوں کو نئے نئے کپڑے سلوا دیے۔ بوٹ لے دیے۔ خود بازار سے وہ اچھے اچھے پھل اور مٹھائیاں مہمانوں کے لیے خرید کر لائی۔ شام ہوتے ہی مہمانوں کی قطاریں آنے لگیں۔ آنے والوں کا استقبال کرشنا اور اس کے پتی نے خندہ پیشانی سے کیا۔ سب ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ گھر میں ایک عجیب قسم کا ہنگامہ تھا، رونق تھی۔ وہ مہمانوں کو دیکھ دیکھ کر پھولی نہیں سما رہی تھی۔ کبھی اپنے لاڈلے کو دیکھتی اور کبھی مہمانوں کو دیکھتی۔ اس نے بڑے خلوص اور محبّت سے مہمانوں کو کھلایا پلایا۔ بار بار انھیں مٹھائیاں پیش کیں، مہمان بھی کھلے دل سے اس کے لاڈلے کو تحفے پیش کر گئے ہریش کے اردگرد تحفوں کے پیکٹوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ اس سلسلہ میں شام سے ساری ہو گئی۔ جب آخری مہمان گیا تو رات کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ ہریش کا جنم دن واقعی بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔ اس میں رونق میل اور سدھر کے

جنم دن کے موقعوں سے کم نہ تھی۔ نو بجے تو بچّے سو گئے، مگر کرشنا تھکاوٹ کے باوجود ابھی جاگ رہی تھی۔ اس کے رشتہ داراس کی امیدوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر تحفے دے گئے تھے۔ ان تحفوں میں اس کی امیدیں تھیں، اس کے لاڈلے کے ارمان تھے اس نے بڑے چاؤ سے اپنے پتی کو بلایا اور پیکٹ کھولنے لگی۔ جب اس نے پیکٹ کھولا تو اس میں سے ایک اندھا شیشہ نکلا۔ یہ ہریش کی ماسی کا تحفہ تھا۔

"دیکھ لیا تو نے اپنی بہن کا تحفہ؟" کرشنا کے پتی نے طنز بھرے لہجہ میں کہا۔

کرشنا کا مونہہ شرم سے لٹک گیا۔ اس نے جلدی سے دوسرا پیکٹ کھولا جو ہریش کی بوا بلا دے گئی تھی۔ "لو یہ سنبھالو کانچ کی گولیاں۔"

تیسرے میں مٹی کے کھلونے تھے اور چوتھا پیکٹ، جو ہریش کے چچا نے دیا تھا اس میں لکڑی کے برادہ سے بھرا ہوا خرگوش تھا، یہ دیکھ کر لاجپت بھی شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اور وہ وہاں سے اٹھا اور جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

اس کے بعد ایک ایک کر کے کرشنا نے سارے پیکٹ کھول ڈالے۔ سب میں اسی طرح کی بے مطلب اور فضول چیزیں تھیں۔ اس میں گیندیں تھیں۔ لٹّو تھے، گلی ڈنڈے تھے، کپڑے تھے، جن کے ڈیزائن خراب تھے، جن کو کیڑوں نے کھا لیا تھا، یا ایسے سلے ہوئے سوٹ تھے جو ہریش کو اس وقت آسکتے تھے جب وہ تین برس کا تھا۔

سارا کمرہ بے کار چیزوں سے بھر گیا تھا۔ یکایک کرشنا کا دل کدورت سے بھر اٹھا۔ اس نے سوچا کیا میرے لاڈلے کے لیے ایسی ہی چیزیں دی جا سکتی تھیں جس چاؤ سے، جس خلوص سے، اس نے اپنے لختِ جگر کا جنم دن منایا تھا، اور جس شوق سے اس نے لوگوں کو بلا کر کھلایا پلایا تھا، اس کے بدلے میں اس کے بچّے کو یہی نکمی بوسیدہ چیزیں ملنی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے آگے وہ تحفے ناچ اٹھے جو اس نے پیا دو بھائی دار نی کے گھران کے لاڈوں کے جنم دن پر دیکھے تھے۔ ایک لمحہ کے

لیے حسد اور حسرت سے اس کا کلیجہ جل اٹھا۔ کیا اس کے بچے کو ایسی چیزیں نہ دی جا سکتی تھیں؟ کیا اس کا بچہ ایسے تحفوں کا حق دار نہ تھا؟ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے ان سوالوں کے جواب کی آس چھوڑ دی، کیونکہ اس کے ذہن میں حقیقت واضح ہو گئی تھی۔ لوگ تحفے محبت کی خاطر نہیں دیتے۔ لوگ اپنے مطلب، اپنی غرض سے مجبور ہو کر تحفے دیتے ہیں۔ پشپا اور تھانے والی کے گھر جو تحفے تحائف اس نے دیکھے تھے وہ دراصل ان بچوں کے لیے نہیں تھے وہ ان غرضوں اور کاموں کے لیے تھے جو لوگ پشپا کے پتی اور تھانے دار سے نکال سکتے تھے وہ ایک طرح کی رشوت تھے جو ہر بڑے اور با اثر آدمی کو جنم دن اور شادی کے نام پر کاغذیں لپیٹ کر دی جاتی ہے۔ اس کا پتی تو کوئی بڑا آدمی نہ تھا۔ وہ کسی بڑے اور با اثر آدمی کی بیوی نہ تھی۔ ان سے تو کسی کے کام نہیں نکل سکتے تھے۔ ان کے پاس محض خلوص تھا، محبت تھی، مہمان نوازی تھی، چاہ تھی، امنگ تھی، سلیقہ تھا۔ پھر اس نے یہ غلطی کیوں کی کہ دنیا کی امید رکھی، اپنے خلوص اور اپنی محبت کا حسین سا جواب چاہا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ کرشنا کو محسوس ہوا کہ وہ اپنی چال بھول گئی تھی۔ وہ خود غرض اور مطلب پرست لوگوں کی دنیا کے نقلی چہرے سے فریب کھا گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اپنی خوشی کو دوسروں کے سانچے میں ڈھالنا بے وقوفی ہے۔ اپنی چال چھوڑ کر دوسروں کی چال اپنانا اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا ہے۔ خوش وہی انسان رہتا ہے جو اپنی زندگی کے لباس کو اپنے کپڑے کے مطابق کاٹتا ہے۔

× × × × × × × ×

نوراج اور پشپا دونوں کو ہی ادب کا شوق تھا۔ جب ان کی شادی ہوئی تو یہی ادبی شوق ان کے درمیان محبت کی ایک کڑی بن گیا تھا۔ بنتا بھی کیوں نہ۔ یہ شوق تو ان کی روحوں میں سمایا ہوا تھا۔ وہ گپیں ہانکنے کے بجائے ناول یا کہانیوں کا مجموعہ پڑھنا پسند کرتے۔ اچھے پکوان کے لیے ان کی طبیعت اتنا نہ مچلتی جتنا وہ نئی کتابوں کے لیے بیقرار رہتی۔ نئے کپڑوں کے لیے بازار جاتے لیکن کتابوں اور رسالوں کے بنڈل لے آتے۔ میاں بیوی شرطیں بدکر پڑھتے۔ راتوں کی نیند حرام ہو جاتی۔ صبح چین نہ ملتا اس دُھن میں کھانا پینا بھول جاتا۔ لوگوں سے رشتہ داروں سے ملنا یاد نہ رہتا کتابیں پڑھنے کے بعد پھر ایک بحث کا دور شروع ہوتا۔ کتابوں کی اچھائی برائی کے سلسلہ میں جذباتی نہیں، مدبرانہ بحث ہوتی۔ کتاب اور مصنف دونوں کا پوسٹ مارٹم بڑی بے دردی سے ہوتا۔ عورتوں کی کردار نگاری کے بارے میں اگر مصنف سے چوک ہوتی۔ تو پشپا بھڑک اٹھتی اور اگر مردوں کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا گیا ہوتا تو نوراج کی زبان سے زہر ٹپکتا۔ اس بحث میں اخلاص اور تہذیب کا دامن تو نہ چھوڑا جاتا۔ البتہ طنز کے تیروں سے مفر نہ تھا۔ میاں بیوی ہوٹل یا سینما میں شام گزارنا پسند نہ کرتے بلکہ گھر بیٹھ کر کتاب کی گہرائیوں میں کھو کر انھیں ذہنی جسمانی اور قلبی راحت اور لذت

میسر آتی۔ انھیں کھانے بنا چین تھا۔ لیکن پڑھے بنا سکون نہ تھا۔ یہی پڑھنے کا چسکا ان کی زندگی کا ایک اہم جزو بن گیا تھا۔

نوراج کا شوق پڑھنے تک ہی محدود نہ تھا بلکہ وہ کچھ نہ کچھ لکھتا بھی تھا اور یہ لکھنا پہلے پہل تو تراجم تک ہی محدود تھا۔ اِن تراجم کا بھی ایک مقصد تھا جب کبھی نوراج کوئی خوبصورت یا تاثیر دولہ انگیز ادبی تخلیق پڑھتا وہ اسے دوسروں کو سنانا چاہتا بتانا چاہتا تاکہ دوسرے دوست بھی اس کے اس ادبی لطف میں شریک ہو سکیں۔ اسی احساس کے زیرِ اثر اس نے کئی ادبی شہ کاروں کو اپنی زبان میں ڈھالا تھا۔ اور پھر جب یہ ترجمہ کسی جریدے میں چھپتا تو وہ کتنا خوش ہوتا تھا۔ اس کی مسرت کی کوئی حد نہ رہتی۔ وہ اشتیاق سے یہ چیزیں اپنے دوستوں کو دکھاتا۔ اپنی بیوی سے ان کا ذکر کرتا۔ اپنا نام چھپا ہوا دیکھ کر اسے کتنی ذہنی خوشی نصیب ہوتی تھی وہ پھولا نہ سماتا تھا۔ اس کے پاؤں دھرتی پر نہ لگتے۔ کتنی ذہنی لذت اسے محسوس ہوتی تھی اور کبھی وہ سوچتا جب وہ اپنی چیزیں لوگوں کے سامنے پیش کرے گا تو اسے کتنا ذہنی حظ نصیب ہوگا۔

اسی آرزو کی تکمیل کے سلسلہ میں نوراج نے خود بھی لکھنا شروع کر دیا تھا اور اس کی کئی ایک چیزیں مختلف رسائل میں چھپی بھی تھیں۔ روز بروز اس کا ادبی شوق بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اب تو یہ لکھنے پڑھنے کا شوق زندگی سے متعلق اس کے خوابوں پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے پاس پڑھنے لکھنے کے لیے ایک خوبصورت کمرہ ہو۔ اسپرنگ دار کرسی ہو۔ میز ہو اور اچھا سا بجلی کا لیمپ۔ بکھری ہوئی کتابوں کو رکھنے کے لیے خوبصورت الماریاں۔ لیکن اس کے پاس گھریلو اخراجات کی وجہ سے کبھی اتنے پیسے اکٹھے نہ ہو سکے کہ وہ اپنی اس چھوٹی سی آرزو کو شرمندۂ تکمیل کر سکتا۔

لیکن کچھ عرصہ بعد اس کی زندگی میں ایک چھوٹا سا انقلاب آیا۔ پتا جو پڑھنے لکھنے

میں اپنے پتی کی شریک تھی، دھیرے دھیرے اس راہ سے ہٹ کر علاحدہ ہو گئی تھی۔ اس کی توجہ کا مرکز اس کے بچے ہو گئے تھے۔ جو ماں کی ممتا کے متلاشی تھے اس کی دیکھ بھال کے متمنی ماں کو فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ اپنا وقت ادبیات کی طرف لگائے۔ کبھی کبھار وہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر ایک آدھ کہانی پڑھ لیتی۔ مگر اب اس کے دل میں پہلا سا ولولہ نہ رہا تھا۔ یہ شوق روز بروز گھٹ کر صفر رہ گیا تھا۔ اور وہ کتابوں اور کہانیوں کے بجائے بچوں کی اور ان کے لیے پھلوں اور کپڑوں کی بات سوچنے لگی تھی۔ لیکن نوراج برابر اپنی ڈگر پر رواں تھا۔ اس کی ساری توجہ گھر گرہستی سے ہٹ کر لکھنے پڑھنے کی جانب لگ گئی تھی۔ وہ لکھے جا رہا تھا۔ اس بات سے بے نیاز کہ اسے کوئی مالی فائدہ ہوگا یا نہیں۔ اُس کے پاس اپنی لکھی کہانیوں کا ذخیرہ تھا جو اُسے پیپا سے بھی عزیز تھا اپنے بچوں سے بھی پیارا۔ اس کے پاس دو ناولوں کے مسودے تھے۔ جو کسی نے نہ چھاپے تھے۔ لیکن وہ انھیں اعلا گردانتا تھا۔ ناکامیوں نے اُسے مایوس نہ کیا تھا بلکہ اس کے شوق کو اور تازیانے لگائے تھے اور وہ اس آس سے جی رہا تھا کہ اس کی ادبی زندگی میں بھی بہار آئے گی۔ امیدوں کی کلیاں مسکائیں گی۔

نوراج کی مشغولیتیں اگر یہاں تک ہی رہتیں تو شاید گھر کی پر سکون فضا میں ہلچل نہ ہوتی۔ مگر اس کے شوق نے اور رنگ اختیار کیا۔ وہ اپنے ادیب دوستوں کو گھر لانے لگا سارا دن گھر میں قہقہے لگتے رہتے۔ گپیں اڑتی رہتیں۔ چائے اور کھانے کے دور چلتے رہتے ادیب کم اور ادب کے ذکر کے ذریعہ وقت کاٹنے والے لوگ نوراج کے ارد گرد بے تکلف ہو کر جمع ہو رہے تھے۔ ان کی گنتی روز بروز بڑھ رہی تھی۔ کوئی آتا پرانے کپڑے اتارا کرنے پہن جاتا۔ کوئی آتا ادھار پیسے مانگ کر لے جاتا۔ کوئی آتا کتابوں کی گٹھڑی باندھ کر لے جاتا۔ انھیں ہنگاموں نے اور اسی افراتفری نے، اسی طوفان بدتمیزی نے پیپا کو صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے مجبور کیا تھا۔ پہلے پہل تو اس نے اشاروں سے احتجاج

کیا پھر وہ گلہ کرنے لگی اور اب یہ گلہ برملا شکایت ہو گیا تھا۔ یہ پڑھنا لکھنا جو کسی زمانے میں محبت کی کڑی تھا۔ اب فساد کی جڑ تھا اور آئے دن پشپا اور نوراج الجھے رہتے۔

اس دن نوراج نے دفتر سے چھٹی لے رکھی تھی۔ ایک نئی کہانی لکھنے کے لیے ایسی کہانی جو پچھلے دس برسوں سے اس کے دماغ میں گھوم رہی تھی۔ ایک عظیم کہانی۔ اُس شہکار کو دماغ سے اتارنے کے لیے۔ اس نے پہلے بھی ایک دو بار کوشش کی تھی لیکن وہ کامیاب نہ ہوا تھا۔ لیکن آج اس نے مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ اس کہانی کو بہر صورت مکمل کرے گا۔ اس کہانی کی تکمیل کی آرزو نے اسے بے قرار کر رکھا اور یہ بے قراری اسے پریشان کیے ہوئے تھی۔ ابھی اس نے کہانی لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہی تھا کہ اس کا ادیب دوست موتی رام خنجر آ دھمکا۔ موتی رام جو گپیں ہانکنے میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا، جو بے کار جھوٹ بولنے میں بے نظیر تھا۔ تانگے والے کو نوراج سے پیسے دلواتا۔ تین تین گھنٹے گپیں ہانکتا، چائے پیتا اور سگریٹ پھونکتا اور پھر خود ہی دوسرے اڈے کے لیے چل دیتا۔ اس دن جتنی دیر وہ نوراج کے پاس بیٹھا رہا، نوراج کی طبیعت بے تابی کے نرغے میں پھنسی تڑپتی رہی۔ اس کے دماغ پر ہتھوڑے پڑتے اور وہ یہ دعا کرتا رہا کہ کسی طرح یہ چلا جائے۔ آج تو اسے اپنی کہانی مکمل کرنی تھی۔ اس لیے جوں ہی موتی رام وہاں سے اٹھا، نوراج کو محسوس ہوا جیسے وہ قید و بند کی صعوبتوں سے رہائی پا گیا ہے ایک کانٹا جو اس کے سینے سے نکل گیا۔ کوئی درد تھا جو کافور ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد ایک بار پھر نوراج نے قلم اٹھائی۔ ابھی اس نے پہلا ہی فقرہ لکھا تھا کہ پشپا آ گئی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ آج وہ برس کر رہے گی۔ اس حادثہ کو ٹالنے کے لیے نوراج نے مزاحاً کہا: "اوہ۔ آپ تشریف لائیے۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"کیوں میرا یہاں آنا برا لگتا ہے" پشپا نے تنک کر جواب دیا۔

بُرا تو نہیں مگر میرا موڈ.....

"اوہو میرے آنے سے آپ کا موڈ خراب ہونے لگا. وہ آپ کا دوست دو گھنٹے اور بھی بیٹھا رہتا تو آپ کو اور آپ کے موڈ کو کوئی خطرہ نہ تھا۔" پنپا نے اب کے پوری تلخی سے وار کیا۔

"دیکھو میری جان، اس وقت نہیں پھر کبھی بحث کریں گے. اب چند لمحوں کی اجازت دے دو تو میں یہ چند صفحے لکھ لوں" نوراج نے گلو خلاصی کے لیے ایک اور رنگ کا پتا پھینکا۔ لیکن پنپا تو آج ترُپ کے پتے لے کر آئی تھی. اس نے فوراً اس کی بات کا مونہہ توڑ جواب دیا "پہلے ہزاروں صفحے سیاہ کر کے آپ نے کون سے پہاڑ گرا لیے ہیں جو یہ دو اور لکھنا چاہتے ہیں؟ سارا دن لکھنا سارا دن پڑھنا، سارا دن نِکھٹے بے کار لوگوں کی مہمان نوازی. تم نے سارا گھر تباہ کر کے رکھ دیا۔"

"پنپا" نوراج یکا یک غصہ سے کانپ اٹھا۔ لیکن اسے کہانی لکھنی تھی. اس لیے اس نے اپنے پر ضبط کرنے کی آخری کوشش کی. لیکن پنپا ضبط کا باندھ توڑ آئی تھی دھاڑتے ریلا در ریلا آتے ہوئے سیلاب کی طرح بغاوت کے جذبات اس کے سینہ سے اڈے چلے آ رہے تھے. تم مجھے ڈرانا چاہتے ہو؟ لیکن اب میں نہیں ڈروں گی میں اب نہیں اس راہ پر چلنے دوں گی. تمہاری یہ حرکتیں، تمہاری یہ مہمان نوازیاں، آدھی تنخواہ کا صفایا کر جاتی ہیں. گھر میں ایک منٹ کے لیے چین اور خاموشی نہیں رہتی رات کے بارہ بارہ بجے تک بجلی جلتی ہے. قہقہے گونجتے ہیں. یہ گھر نہیں رہا. سرائے اور چوپال بن گیا ہے. لیکن اب ایسا نہیں ہو سکے گا. اس گھر میں یا تو کتابیں اور تمہارے دوست رہیں گے یا میں اور میرے بچے۔"

"پنپا" حیرت زدہ نوراج نے آنکھیں پھاڑ کر پنپا کی طرف دیکھا. اس پنپا کی طرف جو خود کبھی کتابوں کی شائق. مطالعہ کی دلدادہ تھی. ادیبوں کی مداح تھی۔

"ہاں۔ اس گھر میں ایک ہی رہ سکتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں تمھیں یہ سن کر غصہ سے زیادہ حیرت کیوں ہوئی ہے۔ لیکن نہ اس میں حیرت کی بات ہے اور نہ شرمندگی کی۔ پہلے میں محض بیوی تھی۔ میری زندگی میں محض تم تھے اور میں تھی۔ اور میں تمھارے اور اپنے شوق کی خاطر بھوکی بھی رہ سکتی تھی اور پیاسی بھی۔ لیکن اب میں ماں ہوں دو بچوں کی ماں۔ وہ ماں جو اپنے بچوں کو بھوکا پیاسا، گندا اور ننگا نہیں دیکھ سکتی، تم ان بچوں کو دیکھو۔ تمھاری ادب نوازیوں نے انھیں اچھے کھانے اچھے کپڑوں سے محروم کر رکھا ہے۔ یہ کسی اچھے اسکول میں نہیں جاتے۔ ان کی صحت، ان کی تربیت" ان کی تعلیم سب تمھارے شوق، تمھاری دوست نوازیوں کی بھینٹ چڑھ رہی ہے۔ تم ان کے لیے ایک باپ نہیں ہو۔ ایک خود غرض انسان ہو"

"پشپا" نوراج نے تقریباً تڑپ کر پشپا کی طرف دیکھا۔ لیکن اسے پشپا دکھائی نہ دی۔ اسے ایک ماں دکھائی دی۔ جو اپنے بچوں کی آسودگی خوشی اور مستقبل کے لیے اپنے شوہر سے باغی ہو گئی تھی۔ ایک پھل دار شاخ نظر آئی۔ جس نے اپنی زندگی کے رس کو محض پھلوں کی پرورش کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اور بھلا دیا تھا اس لذت کو جو اسے کبھی بھونرے کو دیکھ کر اس کے گیت سن کر اسے حاصل ہوتی تھی۔ اور پہلی مرتبہ نوراج نے محسوس کیا پشپا درست ہے اس نے مجھ سے بغاوت نہیں کی۔ قدرت کے ایک تقاضے کے آگے سر جھکا دیا ہے۔ اس نے اپنی خوشی کو اپنے بچوں کی پرورش کے لیے قربان کیا ہے۔ وہ میری تخلیق کی دشمن نہیں ہے۔ ہاں اپنی ان تخلیق کے لیے جو میں نے اس کی گود میں دے دی ہیں یہ ان کی پرورش اور اچھی زندگی کی کوشاں ہے اور پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا اس کا مطالعہ، اس کے ادبی مشاغل، اس کے بچوں کے مفاد کے منافی ہیں۔ وہ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے ان کے تقاضوں کو نظر انداز کر رہا ہے۔ اس نے بے جان تخلیقوں کے لیے اپنی جاندار تخلیق سے بے اتفاتی برتی

اور جیسے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے حقیقت کو دیکھ لیا اور ندامت سے اس کی گردن جھک گئی۔

"پشپا" اس نے پشیمانی سے بھیگے لہجے میں کہا۔ "اب مجھے کچھ اور نہ کہو اب تمہیں کوئی شکایت نہ ہوگی۔ میں نے اپنی ذمہ داری پہچان لی ہے۔ آج سے میں قلم اور کتاب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا...."

اور وہ میز پر رکھے کتابوں کے انبار کی طرف بڑھا۔ وہ شاید انھیں گرانا اور کھڑکی کی راہ باہر پھینکنا چاہتا تھا۔ مگر عین اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ رُک گیا اور ہٹ کر دروازہ کی طرف گیا اور جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور جوں ہی اس کی نظر اندر کے کاغذ پر گئی۔ ایک روشنی سی اس کے چہرہ پر جاگ گئی

پشپا۔ چیک .... پانچ سو روپے کا چیک ــــ میرا ناول بک گیا پشپا بالآخر میرا ناول بک گیا۔ــ اور چیک کو ہوا میں اُچھالتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر پشپا کو اپنی باہوں میں بھر لیا اور اتنے جوش سے کمرے میں گھوم گیا کہ گدگدی اور گھبری سے پشپا کی تقریباً چیخ نکل گئی "مجھے چھوڑو۔ مجھے چھوڑو۔ــ مجھے چیک دیکھنے دو"

اور جب نوراج نے پشپا کو چھوڑ دیا اور اس نے ناول کی منظوری کی چھٹی اور رائیلٹی کے ایڈوانس کا چیک دیکھا تو پہلے تو اس کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا۔ لیکن پھر فوراً اس پر ایک پرچھائی ایک سیاہی سی آگئی۔ اس نے گردن جھکالی۔ اور گھٹنوں میں منہ چھپا لیا۔ لیکن نوراج نے بڑے پیار سے بڑی احتیاط سے اس کے چہرہ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اوپر اٹھایا اور اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "تو نادم نہ ہو۔ میری جان۔ تم نے جو کچھ کیا وہ سو فیصدی درست ہے۔ تم نے مجھے یاد دلایا کہ میں ایک باپ ہوں اور میرا فرض اپنے شوق کی تکمیل نہیں، اپنے

بچوں کی تعلیم و تربیت بھی ہے آج اگر مجھے کامیابی بھی ہوئی ہے تو اس سے تمھاری بات غلط ثابت نہیں ہوئی۔ اس کا مجھے بروقت احساس ہو گیا کہ میرے قلم کی کمائی کا صحیح استعمال میرے بچوں کی تعلیم و تربیت ہے چائے اور سگریٹ نوشی نہیں، غلط قسم کے دوستوں پر پیسہ ضائع کرنا نہیں۔ بے کار وقت برباد کرنا نہیں۔

اور ندامت کے پانی کی گہرائیوں میں ڈوبتی ہوئی پشپا جیسے اُبھر آئی اور سیلاب کی رو میں بہتا ہوا نوراج جیسے لنگر ڈالی ہوئی ناؤ کی طرح ٹھیراؤ پا گیا۔ اور جب دونوں نے اپنا توازن پا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو انھیں محسوس ہوا کہ سیلاب اُتر گیا ہے۔ محبت کا سورج نکل آیا ہے۔ اور مستقبل کا آسمان امید اور مسرت کے نور سے جگمگا اٹھا ہے۔

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷